رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۵۴ عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ ۔ لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۴	بابت اگست ۱۹۶۰ء	عدد ۵

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

محض حرکت ممکن ہے ایک آوارہ و سرگرداں آدمی کے لیے کسی مسرت کا موجب ثابت ہوتی ہو مگر یہ اُس شخص کے لیے قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتی جو اپنی زندگی کا ایک خاص مقصد اور نصب العین رکھتا ہے۔ ایک با مقصد انسان اس کی افادیت یا قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوتے ہمیشہ منزلِ مقصود کو نگاہ میں رکھے گا۔ اگر یہ حرکت اُسے منزل کے قریب لے جانے والی ہو تو وہ صد مبارک ہے لیکن اگر اس حرکت سے منزل کھوئی ہوتی ہو تو پھر یہی اس کے لیے وجہ تشویش اور اضطراب بن جاتی ہے۔

قریب قریب یہی حال اقوام و ملل کا بھی ہے۔ وہ قومیں جو دنیا میں بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اُن کے لیے صرف "برق و بخارات" کی ترقی، روپے کی ریل پیل، عیش و عشرت کے زیادہ سے زیادہ مواقع اطمینان کا موجب ہوتے ہیں لیکن ان کے برعکس وہ قومیں جو اپنے سامنے اخلاقی نصب العین رکھتی ہیں، جن کے پیشِ نظر روحانی مقاصد ہوتے ہیں اُن کے لیے محض اس مادی ساز و سامان کی فراوانی کچھ تسلی بخش نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات اس کی زیادتی انہیں مضمحل اور پریشان کرنے کا باعث بنتی ہے۔ حضرت عمرو بن عوفؓ سے روایت ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کو جزیہ لینے کے لیے بحرین بھیجا۔ وہ بحرین سے مال لیکر آئے۔ انصار نے سنا کہ حضرت ابو عبیدہ آگئے تو وہ صبح کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوتے جب آپ نماز سے فارغ ہو چکے تو وہ سامنے آئے، آپ انہیں دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا میرا خیال ہے تم نے سن لیا، ابو عبیدہؓ بحرین سے کچھ لاتے ہیں۔ انہوں نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: مبارک ہو اور خوشی کی امید رکھو، خدا کی قسم میں تمہارے لیے فقر کو وجہ تشویش نہیں سمجھتا لیکن تمہارے بارے میں مجھے یہ

خطرہ ہے کہ کہیں تمہارے لیے بھی دنیا اس طرح نہ پھیلا دی جائے جیسے تم سے پہلے لوگوں کے لیے پھیلائی گئی تھی تو جیسے اُن کو ہلاک کیا تم کو بھی کہیں ہلاک نہ کر دے۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مال و متاع کی زیادتی اسی صورت میں مبارک ہے جب اس سے اصل منزل سے انحراف نہ ہوتا ہو لیکن اگر اس کی محبت میں گرفتار ہو کر مسلم قوم خود اسے ہی اپنا معبود اور کعبۂ مقصود بنا بیٹھے اور جس طرف فی الواقع اُس کا نصب العین ہے اس سے بالکل الٹی سمت میں بڑھنے لگے تو پھر یہی دولت اُس کے لیے ہلاکت اور بربادی کا پیغام ہے۔ اس کی افزائش سے پھر اُس کے اندر مسرت و شادمانی کی لہر دوڑنے کی بجائے تشویش و اضطراب کے جذبات نمودار ہونے چاہئیں۔

مال و دولت، اولاد، کھیتیاں اور باغات سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں بشرطیکہ کوئی قوم انہیں اللہ کی حدود کے اندر رہ کر استعمال کرے اور ان کی مدد سے اپنے اُس فرض سے سبکدوش ہونے کی فکر کرے جو شاہد علی الناس کی حیثیت سے اُس کے خالق نے اُس پر عائد کیا ہے۔ اگر یہ دنیاوی اسباب اس کے ہاتھ میں منکرات کے استیصال کا ذریعہ بنیں اور معروف کے پروان چڑھانے میں ان سے کام لیا جاتا ہو تو پھر یہ خداوند تعالیٰ کے انعامات ہیں لیکن اگر ان سے ادائے فرض میں کوتاہی ہوتی ہو یا نصب العین سے قدم دُور ہٹتے ہوں تو یہ سب فتنے ہیں جن سے ایک خدا پرست قوم کو ہمیشہ خبردار رہنا چاہیے اور ان سے بچنے کی فکر کرنی چاہیے۔

آپ اس معاملہ پر جتنا زیادہ غور کریں گے آپ کو معلوم ہوگا کہ کسی قوم کے لیے نصب العین کا وجود اور اس سے وابستگی نہ صرف اُس کے لیے مادی مال و اسباب کی اہمیت متعین کرتی ہے بلکہ وہ حرکت کے سارے مظاہر کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی صرف اسی ایک پیمانے سے لگاتی ہے یہی وہ بنیاد ہے جس سے ایک با مقصد قوم ترقی و تنزل، عروج و زوال، خوشحالی

و بدحالی، قوت و بے بسی کا صحیح صحیح مفہوم اپنے دل و دماغ میں بٹھاتی ہے۔ اگر نصب العین آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے یا اس کے لیے دلوں میں کوئی کشش باقی نہ رہے تو پھر یہ سارے الفاظ حروف کے بے معنی پیکر ہیں جنہیں ہر انسان اپنی خواہشِ نفس سے جو معانی چاہے بڑی آسانی کے ساتھ پہنا سکتا ہے۔

امتِ مسلمہ کے اندر آج جو فکری انتشار اور عملی بے راہ روی نظر آتی ہے اُس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ اُس کا اپنے آئیڈیل سے وہ تعلقِ خاطر باقی نہیں رہا جو فی الواقع ہونا چاہیے۔ اُس کے ایک بااثر طبقے نے اپنی قوم کے لیے بھی اُسی مقصد کو اپنا لیا ہے جو اس وقت مغربی اقوام کے پیشِ نظر ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کی روشنی میں وہ اقدارِ حیات متعین کرتا ہے، اسی کے مطابق وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف مسائل کو حل کرنے کی فکر کر رہا ہے۔ لیکن اپنے اس طریقِ کار پر وہ اسلام کا لیبل لگانے پر آپ اپنے آپ کو اس لیے مجبور پاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایسا کیے بغیر مسلمانوں کی عظیم اکثریت اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوگی۔ اس کے نزدیک قومی ترقی کا مفہوم یہی ہے کہ مغربی دنیا کی طرح یہاں بھی مال و دولت کی فراوانی ہو، عظیم الشان عمارات ہوں، بڑے بڑے بنک اور کارخانے ہوں۔ اسی طرح آزادی سے اس کی مراد یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں میں آزادانہ میل جول ہو اور مذہب نے حسن و نظر کے درمیان جو پردے حائل کر رکھے ہیں انہیں یکسر ختم کر دیا جائے۔ الغرض مغرب کی نظر میں جو چیزیں روشن خیالی سمجھی جاتی ہیں انہیں یہاں رواج دیا جائے اور ہر اُس چیز کو مٹایا جائے جو اس راہ میں حائل ہوتی نظر آئے۔

مغربی اسلوبِ حیات کو اسلامی آئیڈیل کے ساتھ اپنانا چونکہ ناممکن سی چیز ہے اس لیے اب اس کی عملی ترکیب یہ نکالی گئی ہے کہ جوں توں کر کے خود اسلام کو اس حد تک بدل دیا جائے کہ اسلام اور کفر کے درمیان کوئی وجہِ امتیاز نہ باقی نہ رہے۔ اور اسلام بھی مغربی تہذیب کی ایک

نہایت ترقی یافتہ صورت دکھائی دینے لگے یہی وہ اصل وجہ ہے کہ اب اسلام سے ایسی ایسی چیزوں کا جواز نکالا جا رہا ہے جنہیں یہ دین اس دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لیے آیا تھا۔کبھی ہم یہ سنتے ہیں کہ یہ سُود جو پیداآوری کاموں کے لیے لیا جاتا ہے یہ بالکل حلال اور طیّب ہے اور مسلمانوں کو اسے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے، کبھی ہمارے کانوں میں یہ آواز آتی ہے کہ گانے بجانے سے آدمی کو کیف و سرور حاصل ہوتا ہے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہے اس لیے اس کا پورا پورا التزام ہونا چاہیے۔کبھی مصوری کو شیوۂ پیغمبری ثابت کیا جاتا ہے، کبھی پردہ کو ایک جاہلانہ رسم بتایا جاتا ہے، کوئی صاحب اُٹھتے ہیں تو وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ ہمارے سارے معتقدات پر ہاتھ صاف کرنے لگتے ہیں اور ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ جنت و دوزخ، حشر و نشر سب اعتباری باتیں ہیں جو عربوں جیسی جاہل قوم کے لیے تو قابلِ قبول ہو سکتی تھیں لیکن ان پر آج ایمان نہیں لایا جا سکتا، کوئی طبقہ ہمیں افلاس سے ڈرا کر تحدیدِ نسل پر آمادہ کر رہا ہے۔یہی اور اسی قسم کے سینکڑوں ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں اسلام سے سندِ جواز حاصل کرنے کی بھرپور کوششیں ہو رہی ہیں۔

آپ ان سارے مسائل کا مطالعہ کریں اور پھر تجزیہ کریں کہ ان میں سے کتنے فی الواقع ہمارے قومی مسائل ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو غیر ملکی سامانِ تعیش کی طرح ہم بلا ضرورت درآمد کر رہے ہیں۔ ان مسائل کی لمبی فہرست میں پچاس فیصد وہ ہیں جن سے ہماری قوم کا دُور کا بھی تعلق نہیں۔وہ نہ تو اس کی فطرت کے مطالبات اور تقاضے ہیں اور نہ ہی اس کے مزاج سے کوئی مناسبت رکھتے ہیں بلکہ انہیں جب بھی ہماری معاشرت میں ہماری خواہش کے علی الرغم داخل کیا جاتا ہے تو سوسائٹی کی عظیم اکثریت متوحش ہو جاتی ہے۔اور قوم کے با اختیار طبقے کو انہیں ملت پر ٹھونسنے کے لیے شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس کشمکش میں ہمارے اندر جو فکری خلفشار پیدا ہو رہا ہے اُس کے متعلق پورے وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حالات کی پیداوار نہیں بلکہ بعض

ناعاقبت اندیش مغرب پرستوں کی فکری بے راہ روی کا افسوسناک انجام ہے کیا مصوری ہمارا قومی مسئلہ ہے اور اس کی طرف سے تغافل ہمارے لیے وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ کیا رقص و سرود کی محفلیں ہماری ملی ضروریات ہیں اور ان کے بارے میں عدمِ توجہی ہمارا ایک ناقابلِ برداشت قومی زیاں ہے؟ کیا شرم و حیا عفت و عصمت نے ہمارے لیے بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا کر رکھے ہیں اور ہم انہیں حل کرنے کے لیے یہاں بے حجابی کو فروغ دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ آپ سوچیے کہ ان میں سے آخر کونسے ایسے مسائل ہیں جن پر ہماری قومی ترقی کا دارومدار ہے۔ اور اگر اُن کے بارے میں ہم نے مغربی طرزِ فکر کو اختیار نہ کیا تو ہم لازمی طور پر تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

باقی رہے زندگی کے وہ مسائل جو ماحول کے آفریدہ ہیں اور جن میں فی الحقیقت مسلم قوم مختلف قسم کی الجھنیں محسوس کرتی ہے، ان کے حل کرنے کے لیے بھی ہم نہ تو وہ اندازِ فکر رکھتے ہیں اور نہ ہی اپنے اندر وہ جرأت پاتے ہیں جو ایک بامقصد قوم کا طغرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ ان کے متعلق ہماری روش بڑی ہی غلط اور احمقانہ ہے۔ ہم بدقسمتی سے یہ فرض کر بیٹھے ہیں کہ خواہ دنیا کی کوئی قوم ہو، اُس کے فکر و نگاہ کے زاویے خواہ کسی انداز کے ہوں، اس کے سامنے مقاصد لازماً وہی ہونے چاہییں جو اس وقت کی مہذب اور ترقی یافتہ اقوام کے پیشِ نظر ہیں۔ اور اس وجہ سے عروج و زوال، خوشحالی اور بدحالی کا معیار بھی نتیجتاً وہی ہونا چاہیے جو ہمیں مغرب سے ملا ہے۔ اس لیے اب امتِ مسلمہ کی بقا اور ترقی کا راز بھی صرف اسی چیز میں مضمر ہے کہ ہم کسی طرح اُن ساری چیزوں کو اپنالیں جن کو دنیائے مغرب اختیار کر چکی ہے۔ ہماری ساری کوششیں اس وقت صرف اسی ایک مرکز پر مرکوز ہیں اور اسی کو ہم فلاحِ امت سمجھتے ہیں۔

اس طرزِ فکر کے حاملین اپنی ساری فلسفہ طرازیوں کے باوجود اس سادہ سی حقیقت کو سمجھنے سے

قاصر ہیں کہ دریا کا دھارا دریا کے رُخ پر بہنے سے تو نہیں بدلا جاتا۔ اس کا تبدیل کرنا بڑا جان جوکھوں کا کام ہے جو زبردست ایثار اور قربانی کا طالب ہے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے ماحول سے لڑ جانے کی ہمت اور عزم رکھتے ہوں، جو مغربی تہذیب و تمدن کی ساری برکتوں سے محروم ہونے پر آمادہ ہوں اور ہر بڑی سے بڑی مصیبت کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

آپ دنیا کی تاریخ پر ایک نگاہ دوڑائیے اور دیکھیے کہ دنیا میں کتنے انقلابات ایسے آئے ہیں جو افکار و نظریات کی سودا بازی کے رہینِ منت ہیں۔ انقلاب جب کبھی آتا ہے تو عزمِ صمیم کے ساتھ آتا ہے اور اس کے پیچھے وہی ذہن کام کرتا ہے۔ جو مداہنت کی ہر اپیل کو ٹھکرا دے، جو وقتی فائدہ و نقصان سے یکسر بے پروا ہو کر آگے بڑھے، اور جسے کوئی لالچ یا طمع اپنی روش سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو اور اس کے سامنے جب بھی کبھی اس قسم کی کوئی صورت پیش کی جاتے تو وہ پکار اُٹھے: "یہ تو معمولی چیزیں ہیں تم اگر آسمان سے چاند اور ستارے بھی نوچ لاؤ، پھر بھی میں اپنے اس مشن کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں جسے میرے ضمیر اور ایمان نے صحیح اور برحق کہا ہے"

دنیا کی ہر انقلابی قوم سود و زیاں کا تعین اپنے مقاصد کی روشنی میں کرتی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ مغرب کے لیے جو چیز بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے وہ ہمارے لیے بالکل غیر اہم بلکہ مضرت رساں ہو اور دوسرے جس چیز کے حصول کے لیے بیتاب نظر آئیں ہم اسے اپنے ہاں سے جلد از جلد مٹانے کے آرزومند ہوں۔

آپ اسی حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیے۔ یورپین اقوام کے دل و دماغ پر اس وقت یہ نظریہ مستولی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی فلاح و کامرانی کا معیار صرف مال و دولت ہے جس قوم کے پاس اس کی فراوانی ہے وہ قوم زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ ہے اور جس کے پاس اس کی کمی ہے وہ پسماندہ اور جاہل ہے۔ اب اسی ایک معیار پر اُن کی اقدارِ حیات مرتب

ہوتی ہیں، اور اسی کے مطابق ان کے خیر و شر کے نظریات ترتیب پاتے ہیں۔ اُن کے ہاں شرافت، اخلاق، ایثار، جرأت میں یہی تصور بطور بنیاد کام کرتا ہے۔ پھر انفرادی زندگی سے آگے نکل کر اجتماعی زندگی میں بھی چیز اُن کا رہنما اصول ہے۔ اُن کے قومی منصوبوں اور اسکیموں میں، اُن کی خارجی اور داخلی پالیسی میں الغرض اُن کی زندگی کے سارے شعبوں میں یہی مادی خلاح و بہبود کا فلسفہ آپ کو کارفرما نظر آئے گا۔ اسی ایک مقصد کے حصول کے لیے وہ قومیں زندہ ہیں اور اسی کے لیے وہ جان کی بازی لگانے پر تیار نظر آتی ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ جن اقوام کے مقاصد یہ ہوں اُن کی سعی و جہد کا انداز، اُن کی معاشرتی زندگی کے ڈھانچے، اُن کے معاشی پروگرام اور اُن کے سیاسی عزائم کبھی بھی وہ نہیں ہو سکتے جو ایک اخلاقی اور روحانی نصب العین رکھنے والی قوم کے ہوتے ہیں۔ منزل کا فرق بالکل فطری طور پر تدبیرِ منزل کے اختلاف پر منتج ہوتا ہے۔ آپ اگر صرف دولتمند بننا چاہیں تو آپ کی کوششوں کی نوعیت دوسری ہوگی اور اس کے برعکس اگر آپ کا اوّلین مقصد علم کا حصول ہے تو پھر آپ کا دائرۂ کار بالکل جداگانہ ہوگا۔

ہمیں جو اس قسمت ہی الجھنیں درپیش ہیں اُن کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم اسلام کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے اور مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار کرنے کے بھی شدید آرزو مند ہیں۔ اگر ہم اپنے مقصد کے معاملے میں یکسو ہوتے تو اس قسم کی کوئی مصیبت ہمیں پیش نہ آتی۔

فقر کے خوف سے تحدیدِ نسل کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں۔ دنیا جب سے قائم ہوئی ہے اسی وقت سے لیکر آج تک انسانی آبادی کے مقابلے میں خوراک ہمیشہ کم رہی ہے اور اسی وجہ سے انسان نے اسے حاصل کرنے کی مسلسل جد و جہد کی ہے۔ اسی کو بڑھانے کے لیے زمین کے سینے کو چاک کیا گیا۔ اس میں بہتر کھاد اور بیج ڈالے گئے، آبپاشی اور کاشتکاری کے نئے نئے تجربات ہوئے اور زراعت کی دنیا میں عجیب و غریب ایجادات ہوئیں۔ آبادی

کے مقابلے میں اگر رزق کی فراوانی ہوتی تو انسان کبھی کوشش نہ کرتا۔ یہ اسی کمی کا نتیجہ ہے کہ اس نے اپنی فکری اور عملی صلاحیتوں کو اس میدان میں کھپایا ہے اور خوراک کی مقدار میں حیرت انگیز اضافہ کیا ہے۔ یہی مسئلہ حضور سرورِ دو عالم کے زمانے میں بھی اہلِ عرب کو درپیش تھا۔ اُس دور کے مسلمان مالی لحاظ سے کچھ بہت زیادہ خوشحال نہ تھے۔ لیکن اس وقت چونکہ اُن کے سامنے جو مقاصد تھے اُن کی نوعیت سراسر روحانی اور اخلاقی تھی اس لیے انہوں نے کبھی کوئی تدبیر ایسی اختیار نہیں کی جس سے ان مقاصد کو نقصان پہنچے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کا کارواں کبھی بھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا اگر وہ اخلاقی اعتبار سے کمزور ہوں۔ اس لیے انہوں نے سب سے زیادہ زور اخلاق کی حفاظت اور پاسبانی پر دیا۔ نکاح کے زیادہ سے مواقع فراہم کیے گئے تاکہ قوم کو زنا کی لعنت سے بچایا جاتے۔ چونکہ اُن کے سامنے نصب العین نہایت واضح اور صاف تھا اس لیے تعددِ ازواج کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہونے والے تھے وہ ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔

اسی طرح سودی کاروبار کا بھی قلع قمع کیا گیا اور اس بات کی مطلق پروا نہ کی گئی کہ اس سے مسلمانوں کو کس حد تک مالی نقصان اٹھانا پڑ گیا۔ اُن کی نگاہ ہمیشہ اپنی منزل کی طرف رہتی تھی اور جو چیزیں اس راہ میں مزاحم ہونے والی تھیں وہ انہیں فوراً راستے سے ہٹا دیتے تھے۔

یہی مسائل آج دیکھیے ہمارے لیے کس قدر موجبِ پریشانی ہیں۔ ہم پر غربت کا خوف اس بُری طرح سے مسلط کیا جا رہا ہے کہ ہم ہر اُس تدبیر کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہیں جس سے اس مصیبت کو ٹالا جا سکے، خواہ اس تدبیر سے ہم منزل سے دُور ہوتے جا رہے ہوں۔ اس خوف و ہراس کے عالم میں ہم غالباً بھول چکے ہیں کہ یہ غربت و امارت بھی اضافی باتیں ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ روپے کی فراوانی اگر ایک قوم کے لیے عزت کی علامت ہے تو دوسری بھی لازمی طور پر اسے یہی حیثیت دیتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ جب کبھی کسی قوم کے سامنے کچھ مسائل آتے ہیں تو ضروری نہیں کہ وہ بھی انہیں اسی طرح حل کرے جس طرح دوسری قوموں نے کیا ہے۔ دنیا کی ہر زندہ قوم ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انہیں طریقوں کو اختیار کرتی ہے جو اس کے مقاصد کے مطابق ہوں۔ بعض قوموں نے سودی کاروبار کو فروغ دیکر اپنے معاشی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے برعکس دنیا میں بعض ایسی قومیں بھی ہیں جنہوں نے اس لعنت کو ختم کر کے اپنے معاشی معاملات کو بہتر بنایا ہے۔ اس طرح افزائش آبادی کا بھی مختلف قوموں پر مختلف ردعمل ہوا ہے۔ بعض نے تحدید نسل کا طریقہ اختیار کیا۔ بعض نے خوراک میں اضافہ کرنے کی فکر کی۔ بعض نے غیر آباد زمینوں کو آباد کیا اور بعض ایسی بھی تھیں جنہوں نے اسی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اپنے سارے معاشرتی اور معاشی ڈھانچوں کو بدل کر رکھ دیا اور اس طرح ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی۔

آج اگر ہم دنیا میں ایک مخصوص تہذیب و تمدن کے علمبردار کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے اپنے مقاصد سے لگن پیدا کرنی چاہیے اور پھر اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ہماری ساری کوششوں کا محور و مرکز صرف خدا کی رضا ہو اور اسی مقصد کے حصول کے لیے ہم جد و جہد کریں۔ آخر ہم نے اس بات کو کیوں فرض کر لیا ہے کہ خیر لازمی طور پر وہی ہے جسے اہلِ مغرب خیر کہیں۔ فلاح و کامرانی کا ہمیں اسلام نے ایک معیار دیا ہے اور ہمیں اسے اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔

تفہیم القرآن

العنکبوت

(۱)

نام چوتھے رکوع کی آیت مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْلِیَآءَ کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں لفظ "عنکبوت" آیا ہے۔ پس یہ نام بھی عنوان نہیں بلکہ محض علامت ہے۔

زمانۂ نزول آیات ۵۶ تا ۶۰ سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورۃ ہجرت حبشہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ باقی مضامین کی اندرونی شہادت بھی اسی کی تائید کرتی ہے، کیونکہ پس منظر میں اسی زمانہ کے حالات جھلکتے نظر آتے ہیں۔ بعض مفسرین نے صرف اس دلیل کی بنا پر کہ اس میں منافقین کا ذکر آیا ہے اور نفاق کا ظہور مدینہ میں ہوا ہے، یہ قیاس قائم کر لیا کہ اس سورہ کی ابتدائی دس آیات مدنی ہیں اور باقی سورۃ مکی ہے۔ حالانکہ یہاں جن لوگوں کے نفاق کا ذکر ہے وہ وہ لوگ ہیں جو کفار کے ظلم و ستم اور شدید جسمانی اذیتوں کے ڈر سے منافقانہ روش اختیار کر رہے تھے، اور ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا نفاق مکہ ہی میں ہو سکتا تھا نہ کہ مدینہ میں۔ اسی طرح بعض دوسرے مفسرین نے یہ دیکھ کر کہ اس سورہ میں مسلمانوں کو ہجرت کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اسے مکہ کی آخری نازل شدہ سورت قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے مسلمان حبشہ کی طرف بھی ہجرت کر چکے تھے۔ یہ تمام قیاسات دراصل کسی روایت پر مبنی نہیں ہیں بلکہ صرف مضامین کی اندرونی شہادت پر ان کی بنا رکھی گئی ہے۔ اور یہ اندرونی شہادت، اگر پوری سورت کے مضامین پر بحیثیت مجموعی نگاہ ڈالی جائے، مکہ کے آخری دور کی نہیں بلکہ اس دور

نے حالات کی نشاندھی کرتی ہے جس میں ہجرت حبشہ واقع ہوئی تھی۔

موضوع و مضمون سورۃ کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ مکہ معظمہ میں مسلمانوں پر بڑے مصائب و شدائد کا زمانہ تھا۔ کفار کی طرف سے اسلام کی مخالفت پورے زور شور سے ہو رہی تھی اور ایمان لانے والوں پر سخت ظلم و ستم توڑے جا رہے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ ایک طرف صادق الایمان لوگوں میں عزم و ہمت اور استقامت پیدا کرنے کے لیے، اور دوسری طرف ضعیف الایمان لوگوں کو شرم دلانے کے لیے نازل فرمائی۔ اس کے ساتھ کفار مکہ کو بھی اس میں سخت تہدید کی گئی کہ اپنے حق میں اُس انجام کو دعوت نہ دیں جو عداوتِ حق کا طریقہ اختیار کرنے والے ہر زمانے میں دیکھتے رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں اُن سوالات کا جواب بھی دیا گیا ہے جو بعض نوجوانوں کو اس وقت پیش آ رہے تھے۔ مثلاً اُن کے والدین ان پر زور ڈالتے تھے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دو اور ہمارے دین پر قائم رہو۔ جس قرآن پر تم ایمان لائے ہو اس میں بھی تو یہی لکھا ہے کہ ماں باپ کا حق سب سے زیادہ ہے۔ تو اب ہم جو کچھ کہتے ہیں اسے مانو ورنہ تم خود اپنے ہی ایمان کے خلاف کام کرو گے۔ اس کا جواب آیت ۸ میں دیا گیا ہے۔

اسی طرح بعض نو مسلموں سے ان کے قبیلے کے لوگ کہتے تھے کہ عذاب ثواب ہماری گردن پر، تم ہمارا کہنا مانو اور اس شخص سے الگ ہو جاؤ۔ اگر خدا تمہیں پکڑے گا تو ہم خود آگے بڑھ کر کہہ دیں گے کہ صاحب ان بے چاروں کا کچھ قصور نہیں، ان کو ہم نے ایمان چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، اس لیے آپ ہمیں پکڑیں۔ اس کا جواب آیات ۱۲-۱۳ میں دیا گیا ہے۔

جو قصے اس سورے میں بیان کیے گئے ہیں ان میں بھی زیادہ تر یہی پہلو نمایاں ہے کہ پچھلے انبیاء کو دیکھو، کیسی کیسی سختیاں ان پر گزریں اور کتنی کتنی مدت وہ ستائے گئے۔ پھر آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مدد ہوئی۔ اس لیے گھبراؤ نہیں۔ اللہ کی مدد ضرور آئے گی۔ مگر آزمائش کا ایک دور گزرنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کو یہ سبق دینے کے ساتھ کفار مکہ کو بھی ان قصوں میں

متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا کی طرف سے پکڑ ہونے میں دیر لگ رہی ہے تو یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ کبھی پکڑ ہوگی ہی نہیں پچھلی تباہ شدہ قوموں کے نشانات تمہارے سامنے ہیں۔ دیکھ لو کہ آخر کار ان کی شامت آکر رہی اور خدا نے اپنے نبیوں کی مدد کی۔

پھر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ اگر ظلم و ستم تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتے تو ایمان چھوڑنے کے بجائے گھر بار چھوڑ کر نکل جاؤ۔ خدا کی زمین وسیع ہے۔ جہاں خدا کی بندگی کر سکو وہاں چلے جاؤ۔

ان سب باتوں کے ساتھ کفار کی تفہیم کا پہلو بھی چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ توحید اور معاد دونوں حقیقتوں کو دلائل کے ساتھ ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے شرک کا ابطال کیا گیا ہے، اور آثارِ کائنات کی طرف توجہ دلا کر ان کو بتایا گیا ہے کہ یہ سب نشانات اس تعلیم کی تصدیق کر رہے ہیں جو ہمارا نبی تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

الف۔ ل۔ م۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟[1] حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے

[1] جن حالات میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے وہ یہ تھے کہ مکہ معظمہ میں جو شخص بھی اسلام قبول کرتا تھا اس پر آفات اور مصائب اور مظالم کا ایک طوفان ٹوٹ پڑتا تھا۔ کوئی غلام یا غریب ہوتا تو اس کو بری طرح مارا پیٹا جاتا اور سخت ناقابلِ برداشت اذیتیں دی جاتیں۔ کوئی دوکاندار یا کاریگر ہوتا تو اس کی روزی کے دروازے بند کر دیے جاتے یہاں تک کہ بھوکوں مرنے کی نوبت آجاتی۔ کوئی کسی با اثر خاندان کا آدمی ہوتا تو اس کے اپنے خاندان کے لوگ اس کو طرح طرح سے تنگ کرتے اور اس کی زندگی اجیرن کر دیتے تھے۔ ان حالات نے مکے میں ایک سخت خوف اور دہشت کا ماحول پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے قائل ہو جانے کے باوجود ایمان لاتے ہوئے ڈرتے تھے، اور

کچھ لوگ ایمان لانے کے بعد جب دردناک اذیتوں سے دوچار ہوتے تو پست ہمت ہو کر کفار کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے تھے۔ ان حالات نے اگرچہ راسخ الایمان صحابہ کے عزم و ثبات میں کوئی تزلزل پیدا نہ کیا تھا، لیکن انسانی فطرت کے تقاضے سے اکثر ان پر بھی ایک شدید اضطراب کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اسی کیفیت کا ایک نمونہ حضرت خبّاب بن ارتؓ کی وہ روایت پیش کرتی ہے جو بخاری، ابو داؤد اور نسائی نے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں مشرکین کی سختیوں سے ہم بری طرح تنگ آئے ہوئے تھے، ایک روز میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی دیوار کے سایے میں تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ آپ ہمارے لیے دعا نہیں فرماتے؟ یہ سن کر آپ کا چہرہ جوش اور جذبے سے سرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا تم سے پہلے جو اہلِ ایمان گزر چکے ہیں ان پر اس سے زیادہ سختیاں توڑی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر بٹھایا جاتا اور اس کے سر پر آرہ چلا کر اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے جاتے۔ کسی کے جوڑوں پر لوہے کے کنگھے گھسے جاتے تھے تاکہ وہ ایمان سے باز آ جائے۔ خدا کی قسم، یہ کام پورا ہو کر رہے گا یہاں تک کہ ایک شخص صنعاء سے حضرموت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا کوئی نہ ہو گا جس کا وہ خوف کرے۔

اس اضطرابی کیفیت کو ٹھنڈے صبر و تحمل میں تبدیل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو سمجھاتا ہے کہ ہمارے جو وعدے دنیا اور آخرت کی کامرانیوں کے لیے ہیں، کوئی شخص مجرد زبانی دعوائے ایمان کر کے ان کا مستحق نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر مدعی کو لازماً آزمائشوں کی بھٹی سے گزرنا ہو گا تاکہ وہ اپنے دعوے کی صداقت کا ثبوت دے۔ ہماری جنت اتنی سستی نہیں ہے، اور نہ دنیا ہی میں ہماری خاص عنایات ایسی ارزاں ہیں کہ تم بس زبان سے ہم پر ایمان لانے کا اعلان کرو اور ہم وہ سب کچھ تمہیں بخش دیں۔ ان کے لیے تو امتحان شرط ہے۔ ہماری خاطر مشقتیں اٹھانی ہوں گی۔ جان و مال کا زیاں برداشت کرنا ہو گا۔ طرح طرح کی سختیاں جھیلنی ہوں گی۔ خطرات، مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ خوف سے بھی آزمائے جاؤ گے اور لالچ سے بھی۔ ہر چیز جسے عزیز و محبوب رکھتے ہو، ہماری رضا پر اسے قربان کرنا پڑے گا، اور ہر تکلیف جو تمہیں ناگوار ہے، ہمارے لیے برداشت کرنی ہو گی۔ تب کہیں یہ بات کھلے گی کہ ہمیں ماننے کا جو دعویٰ تم نے کیا تھا وہ سچا تھا یا جھوٹا۔ یہ بات قرآن مجید میں ہر اس مقام پر کہی گئی ہے جہاں مصائب و شدائد

ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ [۲] اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا [۳] ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

کے ہجوم میں مسلمانوں پر گھبراہٹ کا عالم طاری ہوا ہے۔ ہجرت کے بعد مدینے کی ابتدائی زندگی میں جب معاشی مشکلات، بیرونی خطرات، اور یہود و منافقین کی داخلی شرارتوں نے اہلِ ایمان کو سخت پریشان کر رکھا تھا، اس وقت فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۚ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۗ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (البقرہ۔ رکوع ۲۶)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے (اہلِ ایمان) پر گزر چکے ہیں۔ ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے لوگ پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ تب انہیں مژدہ سنایا گیا کہ خبردار رہو، اللہ کی مدد قریب ہے۔

اسی طرح جنگِ اُحُد کے بعد جب مسلمانوں پر پھر مصائب کا ایک سخت دَور آیا تو ارشاد ہوا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ (آل عمران۔ رکوع ۱۴)

کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے جہاد میں جان لڑانے والے اور پامردی دکھانے والے کون ہیں۔

ان ارشادات سے اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین کی ہے کہ آزمائش ہی وہ کسوٹی ہے جس سے کھوٹا اور کھرا پرکھا جاتا ہے، کھوٹا خود بخود اللہ تعالیٰ کی راہ سے ہٹ جاتا ہے، اور کھرا چھانٹ لیا جاتا ہے تاکہ اللہ کے اُن انعامات سے سرفراز ہو جو صرف صادق الایمان لوگوں کا ہی حصہ ہیں۔

[۲] یعنی یہ کوئی نیا معاملہ نہیں ہے جو تمہارے ساتھ ہی پیش آ رہا ہو۔ تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ جس نے بھی ایمان کا دعویٰ کیا ہے اسے آزمائشوں کی بھٹی میں ڈال کر ضرور تپایا گیا ہے۔ اور جب دوسروں

ارض القرآن کا سفر

(جناب محمد عاصم صاحب)

(۴)

ہم نے راؤ صاحب سے مکان کو کھلا چھوڑنے کی وجہ دریافت کی، تو انہوں نے بتایا کہ ہم تو بسا اوقات اسی طرح مکان کھلا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، پھر سارا سارا دن باہر رہتے ہیں اور جب واپس آتے ہیں تو اپنی ہر چیز کو محفوظ پاتے ہیں۔ اسماعیل خاں صاحب نے بتایا کہ میں جب آپ لوگوں کو لینے کے لیے بحرین گیا تھا، تو اپنے مکان کو کوئی تالا لگا کر نہیں گیا تھا اور جب میں تین دن کے بعد واپس آیا، تو میری ہر چیز محفوظ تھی۔ سعودی حکومت میں امن و امان کے بہت سے واقعات تو ہم نے پہلے بھی سنے تھے اور گذشتہ سفر میں خود بھی اس کیفیت کا مشاہدہ کیا تھا، لیکن یہ دو واقعات تو ہمارے لیے حد درجہ حیرت انگیز تھے۔ سوچیے آخر یہ کس چیز کی برکت ہے؟ ہمارے ہاں بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اگر یہاں شرعی نظام قائم ہو گیا تو لوگوں کے ہاتھ کٹنا شروع ہو جائیں گے۔ جی ہاں چند ہاتھ کٹیں گے، لیکن سارا ملک چین پائے گا۔

بُقیق اگلے دن ۲۱ نومبر کو ہم لوگ اپنے پروگرام کے مطابق بُقیق گئے، جو خُبر سے مغرب کی طرف تقریباً ۴۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور یہاں آرامکو کو سعودی عرب میں تیل کا سب سے بڑا ذخیرہ

(بقیہ تفہیم القرآن)

موجودہ زمانہ میں وقتاً فوقتاً یہ اطلاعات اخبارات میں آتی رہتی ہیں کہ کشتی نوح کو تلاش کرنے کے لیے مہمات بھیجی جا رہی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بسا اوقات ہوائی جہاز جب کوہستان اراراط پر سے گزرے ہیں تو ایک چوٹی پر انہوں نے ایسی چیز دیکھی ہے جو ایک کشتی سے مشابہ ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، ص ۴۰۔ ۴۱ اور ۴۳)

جائیں گے۵؟ بڑا غلط حکم ہے جو وہ لگا رہے ہیں۔

جو کوئی اللہ سے ملنے کی توقع رکھتا ہو (اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے ہی والا ہے۶، اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۷۔ جو شخص بھی مجاہدہ کرے گا۸ اپنے ہی

مقابلے میں صبر و ثبات کی تلقین کرنے کے بعد ایک کلمۂ زجر و توبیخ اُن لوگوں کو خطاب کرکے بھی فرمایا جاتے جو ان حق پرستوں پر ظلم ڈھا رہے تھے۔

۵ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ "ہماری گرفت سے بچ کر کہیں بھاگ سکیں گے"۔ اصل الفاظ ہیں یَّسْبِقُوْنَا یعنی ہم سے سبقت لے جائیں گے۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں (یعنی اپنے رسول کے مشن کی کامیابی) وہ تو نہ ہو سکے اور جو کچھ یہ چاہتے ہیں (یعنی ہمارے رسول کو نیچا دکھانا) وہ ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ ہم ان کی زیادتیوں پر انہیں پکڑنا چاہتے ہوں اور یہ بھاگ کر ہماری دسترس سے دور نکل جائیں۔

۶ یعنی جو شخص حیاتِ اخروی کا قائل ہی نہ ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ کوئی نہیں ہے جس کے سامنے ہمیں اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہو اور کوئی وقت ایسا نہیں آنا ہے جب ہم سے ہمارے کارنامۂ زندگی کا محاسبہ کیا جائے، اس کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ اپنی غفلت میں پڑا رہے اور بے فکری کے ساتھ جو کچھ چاہے کرتا رہے۔ اپنا نتیجہ اپنے اندازوں کے خلاف وہ خود دیکھ لیگا۔ لیکن جو لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ ایک وقت ہمیں اپنے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا بھی پانی ہے، انہیں اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ موت کا وقت کچھ بہت دور ہے۔ ان کو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بس قریب ہی آ لگا ہے اور عمل کی مہلت ختم ہوا ہی چاہتی ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی وہ اپنی عاقبت کی بھلائی کے لیے کر سکتے ہوں کر لیں۔ طولِ حیات کے بے بنیاد بھروسے پر اپنی اصلاح میں دیر نہ لگائیں۔

۷ یعنی اُن کو اس غلط فہمی میں بھی نہ رہنا چاہیے کہ ان کا سابقہ کسی شبہ بے خبر سے ہے۔ جس خدا کے سامنے انہیں جواب دہی کے لیے حاضر ہونا ہے وہ بے خبر نہیں بلکہ سمیع و علیم خدا ہے۔ ان کی کوئی بات

بھلے کے لیے کریگا، اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے ؁۹ ۔ اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک اعمال کریں گے ان کی برائیاں ہم ان سے دُور کردیں گے اور انہیں اُن کے بہترین اعمال کی جزا دینگے ؁۱۰

بھی اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

؁۸ "مجاہدہ" کے معنی کسی مخالف طاقت کے مقابلہ میں کشمکش اور جدوجہد کرنے کے ہیں اور جب کسی خاص مخالف طاقت کی نشاندہی نہ کی جائے بلکہ مطلقاً مجاہدہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک ہمہ گیر اور ہر جہتی کشمکش ہے۔ مومن کو اس دنیا میں جو کشمکش کرنی ہے اس کی نوعیت یہی کچھ ہے۔ اسے شیطان سے بھی لڑنا ہے جو اس کو ہر آن نیکی کے نقصانات سے ڈراتا اور بدی کے فائدوں اور لذتوں کا لالچ دلاتا رہتا ہے۔ اپنے نفس سے بھی لڑنا ہے جو اسے ہر وقت اپنی خواہشات کا غلام بنانے کے لیے زور لگاتا رہتا ہے۔ اپنے گھر سے لیکر آفاق تک کے اُن تمام انسانوں سے بھی لڑنا ہے جن کے نظریات، رجحانات، اصولِ اخلاق، رسم و رواج، طرزِ تمدن اور قوانینِ معیشت و معاشرت دینِ حق سے متصادم ہوں اور اس ریاست سے بھی لڑنا ہے جو خدا کی فرمانبرداری سے آزاد اپنا فرمان چلائے اور نیکی کے بجائے بدی کو فروغ دینے میں اپنی قوتیں صرف کرے۔ یہ مجاہدہ ایک دن دو دن کا نہیں، عمر بھر کا، اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے ہر لمحہ کا ہے۔ اور کسی ایک میدان میں نہیں، زندگی کے ہر پہلو میں ہر محاذ پر ہے۔ اسی کے متعلق حضرت حسن بصری فرماتے ہیں ان الرجل لیجاھد وما ضرب یوماً من الدھر بسیف "آدمی جہاد کرتا ہے خواہ کبھی ایک دفعہ بھی وہ تلوار نہ چلائے"۔

؁۹ یعنی اللہ تعالیٰ اس مجاہدہ کا مطالبہ تم سے اس لیے نہیں کرتا کہ اپنی خدائی قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے اسے تمہاری کسی مدد کی ضرورت ہے اور تمہاری اس لڑائی کے بغیر اس کی خدائی نہ چلے گی۔ بلکہ وہ اس لیے تمہیں اس کشمکش میں پڑنے کی ہدایت کرتا ہے کہ یہی تمہاری ترقی کا راستہ ہے۔ اسی ذریعہ سے تم بدی اور گمراہی کے چکر سے نکل کر نیکی اور صداقت کی راہ پر بڑھ سکتے ہو۔ اسی سے تم میں یہ طاقت پیدا ہوسکتی ہے کہ دنیا میں خیر و صلاح کے علمبردار اور آخرت میں خدا کی جنت کے حق دار بنو۔ تم یہ لڑائی

ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ لیکن اگر وہ

لڑائی لڑ کر خدا پر کوئی احسان نہ کرو گے، اپنا ہی بھلا کرو گے۔

ؔ ایمان سے مراد اُن تمام چیزوں کو سچے دل سے ماننا ہے جنہیں تسلیم کرنے کی دعوت اللہ کے رسول اور اس کی کتاب نے دی ہے۔ اور عملِ صالح سے مراد اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کے مطابق عمل کرنا ہے۔ دل و دماغ کا عمل صالح یہ ہے کہ آدمی کی فکر اور اس کے خیالات اور ارادے درست اور پاکیزہ ہوں۔ زبان کا عمل صالح یہ ہے کہ آدمی برائی پر زبان کھولنے سے بچے اور جو بات بھی کرے حق و انصاف اور راستی کے مطابق کرے۔ اور اعضاء و جوارح کا عملِ صالح یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی اللہ کی اطاعت و بندگی میں، اور اس کے احکام و قوانین کی پابندی میں بسر ہو۔ اس ایمان و عمل صالح کے دو نتیجے بیان کیے گئے ہیں:

ایک یہ کہ آدمی کی برائیاں اس سے دور کر دی جائیں گی۔

دوسرا یہ کہ اسے اس کے بہترین اعمال کی، اور اس کے اعمال سے بہتر جزا دی جائیگی۔

برائیاں دور کرنے سے مراد کئی چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان لانے سے پہلے آدمی نے خواہ کیسے ہی گناہ کیسے ہوں، ایمان لاتے ہی وہ سب معاف ہو جاتیں گے۔ دوسرے یہ کہ ایمان لانے کے بعد آدمی نے بغاوت کے جذبے سے نہیں بلکہ بشری کمزوری سے جو قصور کیسے ہوں، اس کے نیک اعمال کا لحاظ کرکے ان سے درگزر کیا جاتے گا۔ تیسرے یہ کہ ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کرنے سے آدمی کے نفس کی اصلاح آپ سے آپ ہو گی اور اس کی بہت سی کمزوریاں دور ہو جائیں گی۔

ایمان و عمل صالح کی جزاء کے متعلق جو فقرہ ارشاد فرمایا گیا ہے وہ ہے لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کے نیک اعمال میں سے جو اعمال سب سے زیادہ اچھے ہونگے، اُن کو ملحوظ رکھ کر اس کے لیسے جزا تجویز کی جاتے گی۔ دوسرے یہ کہ آدمی اپنے عمل کے لحاظ سے جتنی جزاء کا مستحق ہوگا اس سے زیادہ اچھی جزاء اُسے دی جائیگی۔ یہ بات دوسرے مقامات پر بھی قرآن میں فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں فرمایا مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا

تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھیراتے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر[12]۔ میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے، پھر میں تم کو

(رکوع ۲۰) "جو نیکی لیکر آئے گا اس کو اس سے دس گنا اجر دیا جائیگا" اور سورۂ قصص میں فرمایا مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا (رکوع ۹) "جو شخص نیکی لیکر آئے گا اس کو اس سے بہتر اجر دیا جائے گا" اور سورۂ نساء میں فرمایا إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا (رکوع ۶) "اللہ ظلم تو ذرہ برابر نہیں کرتا، اور اگر نیکی ہو تو اس کو کئی گنا بڑھاتا ہے"

[12] اس آیت کے متعلق مسلم، ترمذی، احمد، ابوداؤد اور نسائی کی روایت ہے کہ یہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ ۱۸-۱۹ سال کے تھے جب انہوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی ماں حمنہ بنت سفیان بن امیہ (ابوسفیان کی بھتیجی) کو جب معلوم ہوا کہ بیٹا مسلمان ہو گیا ہے تو اس نے کہا کہ جب تک تو محمد کا انکار نہ کرے گا میں نہ کھاؤنگی نہ پیوں گی نہ سائے میں بیٹھوں گی۔ ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے۔ تو میری بات نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی کریگا۔ حضرت سعد اس پر سخت پریشان ہوتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ممکن ہے کہ ایسے ہی حالات سے دوسرے وہ نوجوان بھی دوچار ہوتے ہوں جو مکّہ معظمہ کے ابتدائی دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ اسی لیے اس مضمون کو سورۂ لقمان میں بھی پورے زور کے ساتھ دُہرایا گیا ہے (ملاحظہ ہو رکوع ۲)

آیت کا منشا یہ ہے کہ انسان پر مخلوقات میں سے کسی کا حق سب سے بڑھ کر ہے تو وہ اس کے ماں باپ ہیں۔ لیکن ماں باپ بھی اگر انسان کو شرک پر مجبور کریں تو ان کی بات قبول نہ کرنی چاہیے، کجا کہ کسی اور کے کہنے پر آدمی ایسا کرے۔ پھر الفاظ یہ ہیں کہ وَإِنْ جَاهَدَاكَ "اگر وہ دونوں تجھے مجبور کرنے کے لیے اپنا پورا زور بھی لگا دیں" اس سے معلوم ہوا کہ کم تر درجے کا دباؤ، یا ماں باپ میں سے کسی ایک کا زور دینا تو بدرجۂ اولیٰ رد کر دینے کے لائق ہے۔ اس کے ساتھ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (جسے تو میرے شریک کی حیثیت سے نہیں جانتا) کا فقرہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس میں اُن کی بات نہ ماننے کے لیے ایک معقول دلیل دی گئی ہے۔ ماں باپ کا یہ حق تو بے شک ہے کہ اولاد ان کی خدمت کرے، ان کا ادب و احترام کرے، ان کی جائز باتوں میں ان کی

بتا دونگا کہ تم کیا کرتے رہے ہو[۱۱]۔ اور جو لوگ ایمان لاتے ہونگے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہوں گے ان کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے۔

اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر[۱۲]۔ مگر جب وہ اللہ کے

اطاعت بھی کرے لیکن یہ حق ان کو نہیں پہنچتا کہ آدمی اپنے علم کے خلاف ان کی اندھی تقلید کرے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک بیٹا یا بیٹی صرف اس بنا پر ایک مذہب کی پیروی کیے جائے کہ یہ اس کے ماں باپ کا مذہب ہے۔ اگر اولاد کو یہ علم حاصل ہو جائے کہ والدین کا مذہب غلط ہے تو اسے اس مذہب کو چھوڑ کر صحیح مذہب اختیار کرنا چاہیے اور ان کے دباؤ ڈالنے پر بھی اس طریقے کی پیروی نہ کرنی چاہیے جس کی گمراہی اس پر کھل چکی ہو۔ اور یہ معاملہ جب والدین کے ساتھ ہے تو پھر دنیا کے ہر شخص کے ساتھ بھی یہی ہونا چاہیے۔ کسی شخص کی تقلید بھی جائز نہیں ہے جب تک آدمی یہ نہ جان لے کہ وہ شخص حق پر ہے۔

[۱۱] یعنی یہ دنیا کی رشتہ داریاں اور ان کے حقوق تو بس اسی دنیا کی حد تک ہیں۔ آخر کار ماں باپ کو بھی اور اولاد کو بھی اپنے خالق کے حضور پلٹ کر جانا ہے، اور وہاں ہر ایک کی باز پرس اس کی شخصی ذمہ داری کی بنیاد پر ہونی ہے۔ اگر ماں باپ نے اولاد کو گمراہ کیا ہے تو وہ پکڑے جائیں گے۔ اگر اولاد نے ماں باپ کی خاطر گمراہی قبول کی ہے تو اسے سزا ملیگی۔ اور اگر اولاد نے راہ راست اختیار کی اور ماں باپ کے جائز حقوق ادا کرنے میں بھی کوتاہی نہ کی، لیکن ماں باپ نے صرف اس قصور پر اسے ستایا کہ اس نے گمراہی میں ان کا ساتھ کیوں نہ دیا، تو وہ اللہ کے مواخذے سے بچ نہ سکیں گے۔

[۱۲] اگرچہ کہنے والا ایک شخص ہے، مگر "میں ایمان لایا" کہنے کے بجائے کہہ رہا ہے "ہم ایمان لائے"۔ امام رازی نے اس میں ایک لطیف نکتے کی نشان دہی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منافق اپنے آپ کو ہمیشہ زمرۂ اہلِ ایمان میں شامل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ایمان کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ گویا وہ بھی ویسا ہی مومن ہے جیسے دوسرے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بزدل اگر کسی فوج کے ساتھ گیا ہے اور اس فوج کے بہادر سپاہیوں نے لڑ کر دشمنوں کو مار بھگایا ہے، تو چاہے خود اس نے کوئی کارنامہ انجام نہ دیا ہو، مگر وہ آکر یوں کہے گا کہ ہم گئے اور ہم خوب لڑے اور ہم نے دشمن کو شکست فاش دے دی۔ گویا آپ

معاملہ میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا[۱۴]۔ اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آ گئی تو یہی شخص کہیگا کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے[۱۵]۔ کیا دنیا

بھی انہی بہادروں میں سے ہیں جنہوں نے دادِ شجاعت دی ہے۔

۱۴؎ یعنی جس طرح اللہ کے عذاب سے ڈر کر کفر و معصیت سے باز آنا چاہیے، یہ شخص بندوں کی دی ہوئی تکلیفوں سے ڈر کر ایمان اور نیکی سے باز آ گیا۔ ایمان لانے کے بعد کفار کی دھمکیوں اور مار پیٹ اور قید و بند سے جب اسے سابقہ پیش آیا تو اس نے سمجھا کہ اللہ کی وہ دوزخ بھی بس اتنی ہی کچھ ہو گی جس سے مرنے کے بعد کفر کی پاداش میں سابقہ پیش آنا ہے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عذاب تو بعد میں بھگت لونگا، یہ نقد عذاب جو اب مل رہا ہے اس سے بچنے کے لیے مجھے ایمان چھوڑ کر پھر زمرۂ کفار میں جا ملنا چاہیے تاکہ دنیا کی زندگی تو خیریت سے گزر جائے۔

۱۵؎ یعنی آج تو وہ اپنی کھال بچانے کے لیے کافروں میں جا ملا ہے اور اہلِ ایمان کا ساتھ اس نے چھوڑ دیا ہے، کیونکہ دینِ حق کو فروغ دینے کے لیے وہ اپنی نکسیر تک پھڑوانے کو تیار نہیں ہے۔ مگر جب اس دین کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دینے والوں کو اللہ تعالیٰ فتح و کامرانی بخشے گا تو یہ شخص فتح کے ثمرات میں حصہ بٹانے کے لیے آ موجود ہو گا اور مسلمانوں سے کہیگا کہ دل سے تو ہم تمہارے ہی ساتھ تھے، تمہاری کامیابی کے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے، تمہاری جانفشانیوں اور قربانیوں کی بڑی قدر ہماری نگاہ میں تھی۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ ناقابلِ برداشت اذیت یا نقصان، یا شدید خوف کی حالت میں کسی شخص کا کلمۂ کفر کہہ کر اپنے آپ کو بچا لینا، شرعاً جائز ہے بشرطیکہ آدمی سچے دل سے ایمان پر ثابت قدم ہے لیکن بہت بڑا فرق ہے اس مخلص مسلمان میں جو بحالتِ مجبوری جان بچانے کے لیے کفر کا اظہار کرے، اور اس مصلحت پرست انسان میں جو نظریہ کے اعتبار سے اسلام ہی کو حق جانتا اور مانتا ہو مگر ایمانی زندگی کے خطرات و مہالک دیکھ کر کفار سے جا ملے۔ بظاہر ان دونوں کی حالت ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتی۔ مگر درحقیقت جو چیز ان کے درمیان زمین و آسمان کا فرق کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ مجبوراً کفر ظاہر کرنے والا مخلص مسلمان نہ صرف عقیدے کے اعتبار سے اسلام کا گرویدہ رہتا ہے، بلکہ عملاً بھی اس

والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے؟ اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون۔[16]

کی دلی ہمدردیاں دین واہلِ دین کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی کامیابی سے وہ خوش اور ان کو زک پہنچنے سے وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ مجبوری کی حالت میں بھی وہ مسلمانوں کا ساتھ دینے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس تاک میں رہتا ہے کہ جب بھی اس پر سے اعدائے دین کی گرفت ڈھیلی ہو وہ اپنے اہلِ دین کے ساتھ جا ملے۔ اس کے برعکس مصلحت پرست آدمی جب دین کی راہ کٹھن دیکھتا ہے، اور خوب ناپ تول کر دیکھ لیتا ہے کہ دینِ حق کا ساتھ دینے کے نقصانات کفار کے ساتھ جا ملنے کے فوائد سے زیادہ ہیں، تو وہ خالص عافیت اور منفعت کی خاطر دین اور اہلِ دین سے منہ موڑ لیتا ہے، کافروں سے رشتہ دوستی استوار کرتا ہے اور اپنے مفاد کی خاطر ان کی کوئی ایسی خدمت بجا لانے سے بھی باز نہیں رہتا جو دین کے سخت خلاف اور اہلِ دین کے لیے نہایت نقصان دہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اس امکان سے بھی آنکھیں بند نہیں کر لیتا کہ شاید کسی وقت دینِ حق ہی کا بول بالا ہو جائے۔ اس لیے جب کبھی اسے مسلمانوں سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے، وہ ان کے نظریے کو حق ماننے اور ان کے سامنے اپنے ایمان کا اقرار کرنے اور راہِ حق میں ان کی قربانیوں کو خراجِ تحسین ادا کرنے میں ذرہ برابر بخل نہیں کرتا، تاکہ یہ زبانی اعترافات سند رہیں اور بوقتِ ضرورت کام آئیں۔ قرآن کریم ایک دوسرے موقع پر ان منافقین کی اسی سوداگرانہ ذہنیت کو یوں بیان کرتا ہے: اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ښ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (النساء، رکوع ۲۰)

"یہ وہ لوگ ہیں جو تمہارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں (کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے)۔ اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آ کر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور ہم نے پھر بھی تمہیں مسلمانوں سے بچایا؟"

[16] یعنی اللہ آزمائش کے مواقع اسی لیے بار بار لاتا ہے تاکہ مومنوں کے ایمان اور منافقوں کے نفاق کا حال کھل جائے اور جس کے اندر جو کچھ بھی چھپا ہوا ہے وہ سامنے آ جائے۔ یہی بات سورۂ آل عمران میں

اور یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے [۲۱] حالانکہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ اپنے اوپر لینے والے نہیں ہیں [۲۲]، وہ قطعاً جھوٹ کہتے ہیں۔ ہاں ضرور وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت سے بوجھ بھی [۲۳] اور قیامت کے روز یقیناً ان سے ان افترا پردازیوں کی

فرمائی گئی ہے کہ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (رکوع ۱۸)" اللہ مومنوں کو ہرگز اس حالت میں رہنے دینے والا نہیں ہے جس میں تم اس وقت ہو (کہ صادق الایمان اور منافق سب ملے جلے ہیں)۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ نمایاں کر کے رہیگا۔"

[۲۱] ان کے اس قول کا مطلب یہ تھا کہ اول تو زندگی بعد موت اور حشر و نشر اور حساب و جزا کی یہ باتیں سب ڈھکوسلا ہیں۔ لیکن اگر بالفرض کوئی دوسری زندگی ہے اور اس میں کوئی باز پرس بھی ہونی ہے، تو ہم ذمہ لیتے ہیں کہ خدا کے سامنے ہم سارا عذاب ثواب اپنی گردن پر لے لیں گے۔ تم ہمارے کہنے سے اس نئے دین کو چھوڑ دو اور اپنے دین آبائی کی طرف واپس آجاؤ۔ روایات میں متعدد سرداران قریش کے متعلق یہ مذکور ہے کہ ابتداءً جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے ان سے مل کر یہ لوگ اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ابوسفیان اور حرب بن امیہ بن خلف نے ان سے مل کر بھی یہی کہا تھا۔

[۲۲] یعنی اول تو یہی ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص خدا کے ہاں کسی دوسرے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لے اور کسی کے کہنے سے گناہ کرنے والا خود اپنے گناہ کی سزا پانے سے بچ جائے کیونکہ وہاں تو ہر شخص اپنے کیے کا آپ ذمہ دار ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ لیکن اگر بالفرض ایسا ہو بھی، تو جس وقت کفر و شرک کا انجام ایک دہکتی ہوئی جہنم کی صورت میں سامنے آتے گا اُس وقت کس کی یہ ہمت ہے کہ دنیا میں جو وعدہ اس نے کیا تھا اس کی لاج رکھنے کے لیے یہ کہہ دے کہ حضور، میرے کہنے سے جس شخص نے ایمان کو چھوڑ کر ارتداد کی راہ اختیار کی تھی، آپ اسے معاف کر کے جنت میں بھیج دیں، اور میں جہنم میں اپنے کفر کے ساتھ اس کے کفر کی سزا بھی بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔

باز پرس ہوگی جو وہ کرتے رہے ہیں ؏

۹ ۱۰؎ یعنی وہ خدا کے ہاں اگرچہ دوسروں کا بوجھ تو نہ اٹھائیں گے، لیکن دوسرا بوجھ اٹھانے سے بچیں گے بھی نہیں۔ ایک بوجھ ان پر خود گمراہ ہونے کا لدیگا، اور دوسرا بوجھ دوسروں کو گمراہ کرنے کا بھی ان پر لادا جائیگا۔ اس بات کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص خود بھی چوری کرتا ہے اور کسی دوسرے شخص سے بھی کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ چوری کے کام میں حصہ لے۔ اب اگر وہ دوسرا شخص اس کے کہنے سے چوری کرے گا تو کوئی عدالت اسے اس بنا پر نہ چھوڑ دیگی کہ اس نے دوسرے کے کہنے سے جرم کیا ہے۔ چوری کی سزا تو بہرحال اسے ملے گی اور کسی اصولِ انصاف کی رو سے بھی یہ درست نہ ہوگا کہ اسے چھوڑ کر اس کے بدلے کی سزا اس پہلے چور کو دے دی جائے جس نے اسے بہکا کر چوری کے راستے پر ڈالا تھا۔ لیکن وہ پہلا چور اپنے جرم کے ساتھ اس جرم کی سزا بھی پائیگا کہ اس نے خود چوری کی سو کی، ایک دوسرے شخص کو بھی اپنے ساتھ چور بنا ڈالا۔ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر اس قاعدے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لِيَحْمِلُوٓا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (النحل۔ رکوع ۳)۔ "تاکہ وہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے پورے اٹھائیں، اور ان لوگوں کے بوجھوں کا بھی ایک حصہ اٹھائیں جن کو وہ علم کے بغیر گمراہ کرتے ہیں"۔ اور اسی قاعدے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ من دعا الی ھدی کان لہ من الاجر مثل اجور من تبعہ لا ینقص ذالک من اجورھم شیئا ومن دعا الی ضلالۃ کان علیہ من الاثم مثل آثام من تبعہ لا ینقص ذالک من آثامھم شیئا (مسلم)۔ "جس شخص نے راہ راست کی طرف دعوت دی اس کو ان سب لوگوں کے اجر کے برابر اجر ملیگا جنہوں نے اس کی دعوت پر راہ راست اختیار کی بغیر اس کے کہ ان کے اجروں میں کوئی کمی ہو۔ اور جس شخص نے گمراہی کی طرف دعوت دی اس پر ان سب لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ہوگا جنہوں نے اس کی پیروی کی بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کوئی کمی ہو۔"

۱۰؎ "افترا پردازیوں" سے مراد وہ جھوٹی باتیں ہیں جو کفار کے اس قول میں چھپی ہوئی تھیں کہ "تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے۔" دراصل وہ لوگ دو مفروضات کی بنا

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا[21] اور وہ پچاس کم ایک ہزار برس ان کے درمیان رہا[22]۔

پر یہ بات کہتے تھے۔ ایک یہ کہ جس مذہب شرک کی وہ پیروی کر رہے ہیں وہ برحق ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہبِ توحید غلط ہے، اس لیے اُس سے کفر کرنے میں کوئی خطا نہیں ہے۔ دوسرا مفروضہ یہ تھا کہ کوئی حشر نہیں ہونا ہے اور یہ حیاتِ اخروی کا تخیل، جس کی وجہ سے ایک مسلمان کفر کرتے ہوئے ڈرتا ہے، بالکل بے اصل ہے۔ یہ مفروضات اپنے دل میں رکھنے کے بعد وہ ایک مسلمان سے کہتے تھے کہ اچھا اگر تمہارے نزدیک کفر کرنا ایک خطا ہی ہے، اور کوئی حشر بھی ہونا ہے جس میں اس خطا پر تم سے بازپرس ہوگی، تو چلو تمہاری اس خطا کو ہم اپنے سر لیتے ہیں، تم ہماری ذمہ داری پر دینِ محمدؐ کو چھوڑ کر دینِ آبائی میں واپس آجاؤ۔ اس معاملہ میں پھر مزید دو جھوٹی باتیں شامل تھیں۔ ایک ان کا یہ خیال کہ جو شخص کسی کے کہنے پر جرم کرے وہ اپنے جرم کی ذمہ داری سے بری ہو سکتا ہے اور اس کی پوری ذمہ داری وہ شخص اٹھا سکتا ہے جس کے کہنے پر اس نے جرم کیا ہے۔ دوسرا ان کا یہ جھوٹا وعدہ کہ وہ قیامت کے روز ان لوگوں کی ذمہ داری واقعی اٹھا لیں گے جو ان کے کہنے پر ایمان سے کفر کی طرف پلٹ جائیں گے۔ کیونکہ جب قیامت فی الواقع قائم ہو جائے گی اور ان کی امیدوں کے خلاف جہنم ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگی اس وقت وہ ہرگز اس کے لیے تیار نہ ہونگے کہ اپنے کفر کا خمیازہ بھگتنے کے ساتھ اُن لوگوں کے گناہ کا بوجھ بھی پورا کا پورا اپنے اوپر لے لیں جنہیں وہ دنیا میں بہکا کر گمراہ کرتے تھے۔

[22] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو۔ آل عمران، رکوع ۴۔ النساء، ۲۳۔ الانعام، ۱۰۔ الاعراف، ۸۔ یونس، ۸۔ ہود، ۳-۴۔ الانبیاء، ۶۔ المومنون، ۲۔ الفرقان، ۴۔ الشعراء، ۶۔ الصافات، ۳۔ القمر، ۱۔ الحاقہ، ۱۔ نوح

یہ قصے یہاں جس مناسبت سے بیان کیے جا رہے ہیں اس کو سمجھنے کے لیے سورہ کی ابتدائی آیات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ وہاں ایک طرف اہلِ ایمان سے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ان سب اہلِ ایمان کو آزمائش میں ڈالا ہے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ دوسری طرف ظالم کافروں سے فرمایا گیا ہے کہ تم اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تم ہم سے بازی لے جاؤ گے اور ہماری گرفت سے بچ نکلو گے۔ انہی دو باتوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے یہ تاریخی واقعات بیان کیے جا رہے ہیں۔

۲۳؎ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد سے طوفان تک پورے ساڑھے نو سو برس حضرت نوحؑ اس ظالم و گمراہ قوم کی اصلاح کے لیے سعی فرماتے رہے، اور اتنی طویل مدت تک اُن کی زیادتیاں برداشت کرنے پر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری یہی چیز یہاں بیان کرنی مقصود ہے۔ اہلِ ایمان کو بتایا جا رہا ہے کہ تم کو تو ابھی پانچ سات برس ہی ظلم و ستم سہتے اور ایک گمراہ قوم کی ہٹ دھرمیاں برداشت کرتے گزرے ہیں۔ ذرا ہمارے اُس بندے کے صبر و ثبات اور عزم و استقلال کو دیکھو جس نے مسلسل ساڑھے نو صدیوں تک اِن شدائد کا مقابلہ کیا۔

حضرت نوحؑ کی عمر کے بارے میں قرآن مجید اور بائبل کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بائبل کا بیان یہ ہے کہ ان کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ وہ چھ سو برس کے تھے جب طوفان آیا۔ اور اس کے بعد ساڑھے تین سو برس اور زندہ رہے (پیدائش اباب ۷، آیت ۶۔ باب ۹۔ آیت ۲۸۔۲۹)۔ لیکن قرآن کے بیان کی رو سے ان کی عمر کم از کم ایک ہزار سال ہونی چاہیے کیونکہ ساڑھے نو سو سال تو صرف وہ مدت ہے جو نبوت پر مامور ہونے کے بعد سے طوفان برپا ہونے تک انہوں نے دعوت و تبلیغ میں صرف کی۔ ظاہر ہے کہ نبوت انہیں پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد ہی ملی ہوگی۔ اور طوفان کے بعد بھی وہ کچھ مدت زندہ رہے ہونگے۔

یہ طویل عمر بعض لوگوں کے لیے ناقابلِ یقین ہے۔ لیکن خدا کی اس خدائی میں عجائب کی کمی نہیں ہے جس طرف بھی آدمی نگاہ ڈالے، اُس کی قدرت کے کرشمے غیر معمولی واقعات کی شکل میں نظر آجاتے ہیں۔ کچھ واقعات و حالات کا معمولاً ایک خاص صورت میں رونما ہوتے رہنا اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس معمول سے ہٹ کر کسی دوسری غیر معمولی صورت میں کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کے مفروضات کو توڑنے کے لیے کائنات کے ہر گوشے میں اور مخلوقات کی ہر صنف میں خلافِ معمول حالات و واقعات کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جو شخص خدا کے قادرِ مطلق ہونے کا واضح تصور اپنے ذہن میں رکھتا ہو وہ تو کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ کسی

آخر کار ان لوگوں کو طوفان نے آگھیرا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے[۲۳]۔ پھر نوح کو اور کشتی والوں[۲۴] کو ہم نے بچا لیا اور اسے دنیا والوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا کر رکھ دیا[۲۵]۔

انسان کو ایک ہزار برس یا اس سے کم و بیش عمر عطا کر دینا اُس خدا کے لیے بھی ممکن نہیں ہے جو موت و حیات کا خالق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر خود چاہے تو ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر خدا چاہے تو جب تک وہ چاہے اسے زندہ رکھ سکتا ہے۔

۲۳ یعنی طوفان ان پر اس حالت میں آیا کہ وہ اپنے ظلم پر قائم تھے۔ دوسرے الفاظ میں، اگر وہ طوفان آنے سے پہلے اپنے ظلم سے باز آجاتے تو اللہ تعالیٰ ان پر یہ عذاب نہ بھیجتا۔

۲۴ یعنی ان لوگوں کو جو حضرت نوح پر ایمان لاتے تھے اور جنہیں کشتی میں سوار ہونے کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی تھی۔ سورہ ہود میں اس کی تصریح ہے: حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ۔ (آیت ۴۰) "یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آگیا اور تنور اُبل پڑا تو ہم نے کہا کہ (اے نوح) اس کشتی میں سوار کرلے ہر قسم (کے جانوروں) میں سے ایک ایک جوڑا، اور اپنے گھر والوں کو سوائے اُن کے جنہیں ساتھ نہ لینے کا پہلے حکم دیدیا گیا ہے، اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں۔ اور اس کے ساتھ بہت ہی کم لوگ ایمان لائے تھے۔"

۲۵ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ہولناک عقوبت کو یا اس عظیم الشان واقعہ کو بعد والوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ لیکن یہاں اور سورۂ قمر میں یہ بات جس طریقے سے بیان فرمائی گئی ہے اس سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ وہ نشانِ عبرت خود وہ کشتی تھی جو پہاڑ کی چوٹی پر صدیوں موجود رہی اور بعد کی نسلوں کو خبر دیتی رہی کہ اس سرزمین میں کبھی ایسا طوفان آیا تھا جس کی بدولت یہ کشتی پہاڑ پر جا کر ٹکی ہے۔ سورۂ قمر میں اس کے متعلق فرمایا گیا ہے: وَحَمَلْنٰهُ عَلٰي ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ، تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَاۗءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ، وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (آیات ۱۳-۱۵) "اور ہم نے نوح کو سوار کیا تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر، وہ چل رہی تھی ہماری نگرانی میں اس شخص کے لیے جزا کے طور پر جس کا انکار کر دیا گیا تھا، اور ہم نے اسے چھوڑ دیا ایک نشانی بنا کر، پس ہے کوئی سبق لینے والا؟" (بقیہ حاشیہ ۲۴۵ پر)

ارض القرآن کا سفر

(جناب محمد عاصم صاحب)

(۱۴)

ہم نے راؤ صاحب سے مکان کو کھلا چھوڑنے کی وجہ دریافت کی، تو انہوں نے بتایا کہ ہم تو بسا اوقات اسی طرح مکان کھلا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، پھر سارا سارا دن باہر رہتے ہیں اور جب واپس آتے ہیں تو اپنی ہر چیز کو محفوظ پاتے ہیں۔ اسماعیل خاں صاحب نے بتایا کہ میں جب آپ لوگوں کو لینے کے لیے بحرین گیا تھا، تو اپنے مکان کو کوئی تالا لگا کر نہیں گیا تھا اور جب میں تین دن کے بعد واپس آیا، تو میری ہر چیز محفوظ تھی۔ سعودی حکومت میں امن و امان کے بہت سے واقعات تو ہم نے پہلے بھی سنے تھے اور گذشتہ سفر میں خود بھی اس کیفیت کا مشاہدہ کیا تھا، لیکن یہ دو واقعات تو ہمارے لیے حد درجہ حیرت انگیز تھے۔ سوچیے آخر یہ کس چیز کی برکت ہے؟ ہمارے ہاں بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اگر یہاں شرعی نظام قائم ہو گیا تو لوگوں کے ہاتھ کٹنا شروع ہو جائیں گے۔ جی ہاں چند ہاتھ کٹیں گے، لیکن سارا ملک چین پا سکے گا۔

بقیق اگلے دن ۱۲ نومبر کو ہم لوگ اپنے پروگرام کے مطابق بقیق گئے، جو خُبر سے مغرب کی طرف تقریباً ۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور یہاں آرامکو کو سعودی عرب میں تیل کا سب سے بڑا ذخیرہ

(بقیہ تفہیم القرآن)

موجودہ زمانہ میں وقتاً فوقتاً یہ اطلاعات اخبارات میں آتی رہتی ہیں کہ کشتی نوح کو تلاش کرنے کے لیے مہمات بھیجی جا رہی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بسا اوقات ہوائی جہاز جب کوہستان اراراط پر سے گزرے ہیں تو ایک چوٹی پر انہوں نے ایسی چیز دیکھی ہے جو ایک کشتی سے مشابہ ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، ص ۴۰۔ ۳۴۰ اور ۳۴۱)

ملا ہے۔ یہاں بھی پاکستان کے بہت سے ملازمین رہتے ہیں۔ ۱۰ بجے سے ۱۲½ بجے دوپہر تک یہاں بھی سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری رہا۔ حاضرین میں سب ہی طرح کے لوگ تھے۔ ایسے بھی تھے، جو مولانا کی کتابیں پڑھتے ہوتے اور ان سے متاثر تھے۔ ایسے بھی تھے جو پرویز صاحب کے لٹریچر سے متاثر تھے اور چند تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے تھے۔ آج کے سوالات پاکستان کے موجودہ حالات میں اسلام کے لیے کام کرنے کے طریقوں، بنیادی جمہوریتوں، تبلیغی جماعت سے مل کر کام کرنے یا نہ کرنے اور اہل کتاب کا ذبیحہ جائز یا ناجائز ہونے کے متعلق تھے۔

پہلے سوال کا جواب مولانا نے یہ دیا کہ پاکستان میں بوقت جو حالات پائے جاتے ہیں اُن میں اگر جماعتیں کام نہ بھی کر سکیں تو افراد تو باقی ہیں، اور اللہ کے دین سے ان کا تعلق بھی باقی ہے، اور اگر انہوں نے اپنے خدا سے اس کے دین کی خدمت کا کوئی عہد و پیمان کیا تھا تو وہ بھی ختم نہیں ہو گیا۔ اس لیے ہر ایسے فرد کو اپنی انفرادی حیثیت میں اپنی صواب دید کے مطابق دین کی وہ خدمت کرنی چاہیے جو وہ کر سکتا ہو۔ اس میں نہ کوئی چیز مانع ہے نہ ہو سکتی ہے۔

تبلیغی جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنے کے متعلق فرمایا کہ ہم لوگ اپنی صوابدید کے مطابق دین کا کام کر رہے ہیں اور تبلیغی جماعت والے اپنی صوابدید کے مطابق۔ ہمارے اور ان کے طریق کار میں چونکہ اختلاف ہے اس لیے مل کر کام کرنے کا تو سوال پیدا نہیں ہو سکتا لیکن طریق کار میں اختلاف ہونے سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ ہمارے اور ان کے درمیان تصادم یا مخالفت ہو، اور ہم خواہ مخواہ ایک دوسرے کی مزاحمت کریں اور ایک دوسرے کے کام میں کیڑے ڈالنے کی کوشش کریں۔ اس کے بجائے اگر ہم اور وہ ایک ہی خدا کے دین کی اخلاص کے ساتھ خدمت کر رہے ہیں تو ہمیں ایک دوسرے کا خیر خواہ ہونا چاہیے اور جس حد تک ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں، یا ایک دوسرے سے مدد لے سکتے ہیں اس میں ہم کو دریغ نہ کرنا چاہیے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ تو نہ ہونا چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں رکھیں اور انہیں لوگوں میں پھیلاتے پھریں۔ آخر میں مولانا نے حاضرین سے یہ بھی فرمایا کہ آپ لوگ سب کچھ پڑھیے اور ہر ایک کے کام کو دیکھ کر خود فیصلہ کیجیے کہ آپ کا

دل کس طریقِ کار سے زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔ پھر جسے بھی آپ پسند کریں اس کو اختیار کر لیجیے۔

اہلِ کتاب کے ذبیحہ کے متعلق مولانا نے مختصر طور پر اپنی وہی رائے ظاہر فرمائی، جو اپریل ۱۹۵۹ء کے ترجمان القرآن میں مفصل طور پر شائع ہو چکی ہے[1]۔

۱۲ ½ بجے سے ۳ بجے تک نماز، کھانے اور آرام کا وقفہ رہا۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ تک پھر سوالات و جوابات کا سلسلہ رہا۔ عصر کی نماز کے بعد ہم لوگ ثُقبق کے قاضی صاحب کے ہاں گئے۔ دراصل صبح ہی جب ہم ثُقبق پہنچے تھے، تو قاضی صاحب نے مولانا کو پیغام بھیجا تھا اور انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ مولانا نے ان سے عصر کے بعد آنے کا وعدہ کیا۔ ہم گئے تو ہمارے ساتھ بیس پچیس آدمی اور بھی ہو لیے جس سے قاضی صاحب بہت خوش ہوئے اور انہوں نے قہوہ، پھر چائے اور پھر دوبارہ قہوہ سے ہم سب کی تواضع فرمائی۔ قاضی صاحب یہاں ثُقبق میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے شعبہ کے انچارج بھی ہیں، اس لیے انہوں نے مولانا کا شکریہ ادا فرمایا کہ ان کے آنے پر یہ پاکستانی نوجوان دین کی باتیں سننے کے لیے جمع ہوئے۔

---

[1] یہ تمام جوابات میں اپنی یاد کے مطابق نقل کر رہا ہوں، کیونکہ اُس وقت مَیں نے انہیں اپنی ڈائری میں اس لیے قلمبند نہیں کیا تھا کہ حاضرین میں سے بعض نے ساری گفتگوئیں ٹیپ ریکارڈ کر لی تھیں اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس کا مکمل ٹیپ ہمیں بھی مہیا کریں گے۔ چنانچہ اس دن کی گفتگو کے اور اس کے بعد ظہران وغیرہ میں مولانا کی جو گفتگوئیں ہوئیں، ان سب کے ریکارڈ لاہور پہنچ چکے ہیں، لیکن مشین نہ ہونے کی وجہ سے اب تک ہم ان گفتگوؤں کو ٹیپ سے سن نہیں سکے ہیں۔ علاوہ ازیں ثُقبق کی اس مجلس میں بعض دوسرے موضوعات سے متعلق بھی مولانا سے سوالات کیے گئے تھے اور مولانا نے ان کے بھی مفصل جوابات دیئے تھے۔ انہیں بھی میں اسی ٹیپ ریکارڈ کی وجہ سے قلمبند نہیں کر سکا۔ امید ہے جلدی ہی مشین کا انتظام ہو جائے گا اور ہم ان تمام گفتگوؤں کو قلمبند کر سکیں گے۔ اس وقت اگر ضرورت محسوس ہوئی، تو ان ساری گفتگوؤں کو کتابی شکل میں شائع بھی کر دیا جائے گا۔

(م ۔ ع)

مغرب کے بعد ہم اپنی قیام گاہ پر واپس آئے اور عشاء کے بعد ایک عرب نوجوان، جن کا نام یعقوب ہے اور جو خُبر کے مقامی باشندے ہیں، کے ہاں کھانے پر گئے۔ یعقوب ہیں تو نوجوان، لیکن گہرا دینی جذبہ رکھتے ہیں اور اس زمانہ میں دین کے تقاضوں اور اس کے لیے کام کرنے کی ضرورت سے خوب واقف ہیں۔ وہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں۔ بیروت کے قیام کے زمانہ میں وہ حسن البنا شہید اور مولانا مودودی کی کتابوں سے متاثر ہوئے۔ اس لیے نہ صرف یہ کہ امریکن یونیورسٹی کا ماحول انہیں بگاڑ نہ سکا، بلکہ اس زمانہ میں انہوں نے بہت سے دوسرے نوجوانوں کو بھی اس ماحول کا اثر قبول کرنے سے بچا لیا۔ جب ہم ان کے ہاں پہنچے تو وہاں ان ہی کی طرح کے آٹھ دس نوجوان موجود تھے جن میں بعض مقامی تھے اور بعض شام، فلسطین اور مصر کے رہنے والے۔ وہیں ہماری ملاقات استاذ عبدالحکیم عابدین سے ہوئی، جو اتفاق سے دو روز پیشتر ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں جدہ سے خُبر آئے ہوئے تھے۔ ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور ان کی زبانی مصر و شام کے بہت سے حالات معلوم ہوئے۔ استاذ عبدالحکیم عابدین، حسن البنا شہیدؒ کے بہنوئی اور اخوان المسلمون (مصر) کے جنرل سکرٹری تھے۔ یہ اخوان کے ان چار آدمیوں میں سے ایک ہیں، جنہیں ۵۳ء میں مصری حکومت نے مصری قومیت سے محروم کیا تھا (اور قومیت سے محروم بھی صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ پہلے ہی ملک سے باہر تھے، ورنہ اگر وہ اندر ہوتے تو ان کا انجام بھی وہی ہوتا جو عبدالقادر عودہ شہیدؒ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کا ہوا)۔ اب انہوں نے سعودی شہریت اختیار کر لی ہے۔ ان کے بچے جدہ میں رہتے ہیں اور یہ خود جدہ اور بیروت میں وکالت کرتے ہیں۔

کھانا کھایا اور اس کے بعد کافی دیر تک ان لوگوں سے گفتگو ہوتی رہی، جس سے ہمیں بھی اور انہیں بھی ایک دوسرے کے حالات سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔

ظہران | ۱۳ نومبر کو ہم اپنے پروگرام کے مطابق ظہران گئے اور وہاں بھی ۱۱ بجے سے ۱/۲ ۲ بجے تک سوالات و جوابات کا سلسلہ رہا۔ اس دن جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز ہم نے کوارٹروں ہی کی مسجد

میں پڑھی۔ خطیب و امام ایک نجدی عالم تھے۔ خطبہ تو انہوں نے غنیمت دیا لیکن نماز میں قرآن مجید کی قرأت صحیح نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نجد میں قرآن مجید کی صحیح قرأت سکھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے اور یہ اعتماد کر لیا گیا ہے کہ جب یہ لوگ عرب ہیں تو قرآن آپ سے آپ صحیح پڑھیں گے۔

جمعہ کے بعد کھانے اور آرام کرنے کا وقفہ رہا اور ۴ ½ سے ۵ ¾ تک پھر سوالات و جوابات کا سلسلہ رہا۔ اس دن کی یہ ساری گفتگو ٹیپ ریکارڈ کی گئی۔

کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں جو پاکستانی حضرات یہاں مقیم ہیں، ان میں اکثریت تو ایسے لوگوں کی ہے جنہیں کمانے اور کھانے کے سوا کوئی دوسری فکر نہیں ہے۔ تہائی حصّہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے۔ جو دینی حس رکھتے ہیں اور فکری لحاظ سے کسی نہ کسی مکتبِ فکر سے وابستہ ہیں یا اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ایک صاحب قادیانی بھی ہیں، مگر وہ اپنے آپ کو قادیانی ظاہر نہیں کرتے اور نہ ان کی یہاں کوئی سرگرمیاں ہیں۔ ایک صاحب احراری بھی ہیں، مگر عملاً وہ بھی خاموش ہیں۔ بارہ کے قریب تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ یہ لوگ یہاں بھی مختلف بستیوں میں تبلیغی دوروں کے لیے نکلتے اور لوگوں کو نماز کی تلقین کرتے اور ان کا کلمہ صحیح کراتے رہتے ہیں۔

چند لوگ ایسے بھی ہیں جو پرویز صاحب سے متاثر ہیں اور یہاں اچھی خاصی سرگرمی سے ان کے خیالات کی اشاعت کر رہے ہیں۔ مولانا سے بڑی عقیدت سے ملتے رہے لیکن ان سے طرح طرح کے اُلٹے سیدھے سوالات کر کے انہیں اُلجھانے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ ۱۳ر نومبر کو انہوں نے مولانا کو اپنے ہاں آنے اور چند سوالات (جو انہوں نے پہلے سے مولانا کو لکھ کر دے دیئے تھے) کا جواب دینے کی دعوت دی۔ انہوں نے یہ سوالات بڑے سوچ بچار کے بعد مرتب کیے تھے اور عام لوگوں میں یہ کہتے پھرتے تھے کہ آج دیکھنا ہے مودودی صاحب کتنے پانیوں میں ہیں۔

ہم عشا کے بعد ان کے ہاں گئے۔ وہاں دو ڈھائی سو آدمی جمع تھے اور لاؤڈ سپیکر اور تمام سوالات و جوابات کو ٹیپ ریکارڈ کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ مولانا نے ان تمام سوالات کا اور ان کے بعد جو بہت سے دوسرے سوالات کیے گئے، ان کا بھی بڑی تفصیل سے جواب دیا، جس کا تمام

حاضرین پر بہت ہی اچھا اثر ہوا۔ اگرچہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا کے جوابات سے خود ان حضرات کی بھی اصلاح ہو گئی ہو گی، لیکن یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ جو لوگ ابھی دام پرویزی میں نہیں پھنسے ہیں وہ آئندہ کے لیے محفوظ ہو گئے ہوں گے۔

دمام | اگلے دن ۱۳ اکتوبر کو ہم لوگ عصر تک اپنی قیام گاہ ہی پر رہے اور مولانا آئندہ سفر کی تیاری کے سلسلے میں بعض کتابوں کا مطالعہ فرماتے رہے۔ مغرب کے قریب ہم چودھری محمد اکبر صاحب (سیالکوٹ) کے صاحبزادے انور پاشا صاحب کے ہاں دمام گئے، جو کاروبار کے سلسلے میں ان دنوں وہاں مقیم ہیں۔ انہوں نے مغرب کے بعد ہمیں اپنے ہاں کھانے پر بلایا تھا۔ اس بہانے سے ہمیں دمام دیکھنے کا بھی موقع مل گیا۔ دمام سعودی عرب کے منطقہ شرقیہ (جس میں خبر، راس تنورہ، دمام، بقیق، ہفوف اور احساء کے اضلاع شامل ہیں) کا صدر مقام ہے اور یہیں اس منطقہ کا گورنر رہتا ہے۔ پہلے اس منطقہ کا صدر مقام ہفوف تھا، لیکن جب سے تیل دریافت ہوا ہے اور آرامکو نے ظہران میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا ہے، دمام کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں دمام، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، سعودی عرب کے مشرقی ساحل کی سب سے بڑی بندرگاہ اور تھوک مال کی منڈی بھی ہے، اور یہاں سے ظہران، بقیق اور ہفوف وغیرہ کے راستے ریل اور سڑک دونوں ریاض تک جاتی ہیں۔ انور پاشا صاحب کے ہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ جو سب کے سب سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ سیالکوٹی لوگوں کی خبر، ظہران، راس تنورہ، بقیق اور ریاض وغیرہ ہر مقام پر اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ ہم جہاں بھی گئے ہمیں سیالکوٹ کا کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ملا، یہاں تک کہ ان کے متعلق کمپنی کے ملازمین میں ایک لطیفہ یہ مشہور ہے کہ چند لوگ راکٹ کے ذریعے چاند پر پہنچے تو انہیں وہاں چند آدمی ٹہلتے ہوئے ملے۔ انہوں نے ان سے دریافت کیا کہ تم لوگ کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ سیالکوٹ کے۔ غالباً سیالکوٹ کے لوگ جو اس کثرت سے ملک سے باہر نکلے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد اس شہر کی بہت سی صنعتیں تباہ ہو گئی ہیں اور معاشی طور پر یہ لوگ پریشان ہیں۔

عشاء کے بعد ہم دمام ہی کے ایک مقامی باشندے شیخ جاسم کے ہاں گئے، جو ایک دفعہ پہلے مولانا کے پاس آئے تھے اور ان سے اپنے ہاں آنے کا وعدہ لے گئے تھے۔ وہاں پہنچے تو چند عرب نوجوان ایک کمرے میں جمع تھے اور انہوں نے مولانا سے اس زمانے میں دعوتِ اسلامی کے لیے کام کرنے کے متعلق ہدایات طلب کیں۔ یہ سلسلہ رات کے ۱۱½ بجے تک جاری رہا اور اس کے بعد ہم خُبَر واپس آ گئے۔

گورنر سے ملاقات اور شاہی مہمانی ان چار دنوں (۱۱ تا ۱۴ نومبر) میں ہم اس قدر مصروف رہے کہ ہمیں اپنے آئندہ سفر کے لیے تیاری کرنے کی بالکل فرصت نہ مل سکی۔ ۱۵ نومبر کو مولانا نے کسی ملاقات کے لیے باہر جانے سے صاف انکار کر دیا اور آئندہ سفر کے سلسلے میں تیاری شروع کی۔ راؤ اختر صاحب کو دو کاموں کے لیے روانہ کیا۔ ایک تو کراچی سے روانہ ہوتے ہوئے سعودی سفیر نے ہمیں جو خطوط دیئے تھے، ان میں سے ایک میں ہمیں تمام رسوم (ٹیکسوں) سے معاف کیا گیا تھا اس خط کا مجھے اور راؤ صاحب کو علم نہ تھا، اس لیے ہم نے ہوائی اڈہ اور بندرگاہ پر سعودی عرب میں داخلہ کے پچاس پچاس ریال ادا کر دیئے تھے۔ مولانا نے راؤ صاحب کو یہ خط دیا کہ وہ ہوائی اڈہ اور بندرگاہ پر جا کر سو ریال واپس لے آئیں۔ اسی طرح دمام میں چودھری غلام محمد صاحب کا پاسپورٹ بھی روک لیا گیا تھا، اسے بھی واپس لینا تھا۔ دوسرے مشورہ ہوا کہ خُبَر سے ریاض روانہ ہونے سے پہلے منطقہ شرقیہ کے گورنر امیر سعود بن جلوی (جو شاہ سعود کے ماموں بھی ہیں) کے ہاں ایک کرٹسی کال (زیارۃ المجاملہ) ضرور کر لینی چاہیے۔ اس لیے راؤ اختر صاحب کو دارالامارۃ (قصر الامیر) بھی بھیجا گیا کہ ملاقات کے لیے وقت مقرر کر آئیں۔ لیکن جب راؤ صاحب وہاں پہنچے تو امیر کے بڑے صاحبزادے امیر عبدالعزیز نے ان سے کہا کہ ہمیں ابھی تک مولانا کے خُبَر پہنچنے کی اطلاع نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ انہیں ایئرپورٹ ہوٹل میں ٹھہراتے، کیونکہ وہ شاہی مہمان ہیں اور انہیں ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچانے کی ہمیں وزیر اعظم کی طرف سے ہدایات موصول ہو چکی ہیں۔ امیر عبدالعزیز نے راؤ صاحب سے یہ گلہ بھی کیا کہ آپ نے اب تک مولانا کو اپنے

ہاں کیوں ٹھہرائے رکھا؟ الغرض بارہ بجے کے قریب راؤ اختر صاحب کے ساتھ امیر کا ایک آدمی آیا اور اس نے امیر کی طرف سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مولانا سے اصرار کیا کہ جلد از جلد ایرپورٹ ہوٹل میں منتقل ہو جائیں۔ ہم نے سامان باندھنے کے لیے ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی مہلت طلب کی اور پھر دو بجے کے قریب ہوٹل پہنچ گئے۔ ایرپورٹ کا یہ ہوٹل بہت ہی شاندار اور بالکل نئے طرز کا بنا ہوا ہے اور اس میں زیادہ تر حکومت ہی کے مہمان ٹھہرتے ہیں۔ غالباً ظہران، خُبَر اور دَمام میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا ہوٹل ہے بھی نہیں۔

شام کو ۴½ بجے ہم لوگ امیر سعود بن جلوی کی ملاقات کے لیے دارالامارہ گئے۔ ایک نہایت شاندار کمرے میں امیر سعود کی نشست تھی اور پورا شاہی دربار کا سا سماں تھا۔ ان کی صحت ان دنوں خراب تھی، اس لیے وہ مولانا سے مصافحہ اور سلام کے بعد خود گفتگو نہ کر سکے۔ درمیان میں سیکرٹری تھا اور اسی کے ذریعے گفتگو ہوتی رہی۔ مولانا نے انہیں اپنی چار کتابیں (مبادئ الاسلام، الحجاب، الربا اور نظریۃ الاسلام الخلقیہ) پیش کیں اور کراچی سے لایا ہوا سوہن حلوہ کا ایک ڈبہ بھی دیا۔ مغرب کے بعد انہوں نے ہم لوگوں کو کھانے پر بلایا۔ مغرب کے بعد جب ہم الامارۃ پہنچے، تو امیر خود تو موجود نہ تھے، انہوں نے کھانے میں شرکت سے اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر معذرت کر دی تھی۔ ان کے بڑے صاحبزادے امیر عبدالعزیز ان کی نیابت کے لیے موجود تھے اور ان ہی نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے پر ہمارے علاوہ بہت سے شیوخ موجود تھے۔ وزیر اعظم قَطَر کا بڑا لڑکا اور ایک امریکن بھی شریک تھے۔ کھانا بالکل مغربی طرز کا تھا اور مغربی طرز ہی پر چھری اور کانٹے سے کھایا گیا۔ شاہ سعود اور دوسرے امراء کی جو دعوتیں صرف عربوں کے لیے ہوتی ہیں، وہ غالباً اب بھی عربی طرز ہی پر ہوتی ہیں۔ اس دعوت پر میرے اور راؤ اختر صاحب کے ساتھ ایک عجیب لطیفہ پیش آیا، جو شاید دوسروں کے لیے تو لطیفہ ہو، لیکن ہمارے اپنے لیے ندامت کا باعث ہے۔ اور وہ یہ کہ سروس کرنے والے خادم باری باری تمام مہمانوں کے سامنے کھانے کی ڈش پیش کر رہے تھے۔ دوسری مرتبہ وہ مرغی کے گوشت کی ڈش لائے۔ مولانا سمجھ گئے اور انہوں نے یہ گوشت نہ اٹھایا، لیکن مَیں اور راؤ صاحب سمجھ نہ سکے اور ہم نے وہ گوشت لے کر

کھا لیا۔ سروس کرنے والے خادم ہندوستانی تھے۔ انہوں نے ہمیں بعد میں بتایا کہ یہ ڈبہ کی مرغی تھی ہمیں سخت افسوس ہوا۔ یاد نہیں کہ چودھری صاحب بھی محفوظ رہے یا وہ بھی ملوث ہو گئے۔

یہاں دمام میں گجرات (پاکستان) کے ایک ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں، جن کا نام عبدالمجید حسن ہے اور وہ سولہ سال سے یہیں مقیم ہیں۔ امیر سعود بن جلوی کے ذاتی ڈاکٹر ہیں اور آرامکو میں بھی آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں۔ اپنی پرائیویٹ پریکٹس الگ کرتے ہیں۔ انہوں نے مولانا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی، کیونکہ اسلام کے متعلق ان کے ذہن میں چند اشکالات تھے اور وہ ان کا حل چاہتے تھے۔ چودھری صاحب کو بھی ان سے اپنے لیے دوا لینی تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم ان کے ہاں گئے۔ علیک سلیک اور رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے مولانا سے چائے پینے کی درخواست کی۔ چائے کے لیے ہم ان کے مکان کی سب سے اوپر کی منزل میں گئے، جہاں ان کی اپنے بال بچوں کے ساتھ رہائش ہے۔ اس وقت ان کے بچے ٹیلیویژن دیکھ رہے تھے۔ ٹیلیویژن پر اس وقت ظہران ایرپورٹ کا پروگرام جاری تھا اور فٹ بال کا میچ ہو رہا تھا۔ جب تک چائے تیار نہیں ہوئی، ہم بھی ٹیلیویژن پر یہ میچ دیکھتے رہے۔ یہ میرے لیے ٹیلیویژن دیکھنے کا پہلا موقع تھا۔ شکر ہے اس وقت صرف فٹ بال کا میچ ہو رہا تھا، کوئی دوسرا پروگرام نہ تھا۔ یہاں ظہران میں ٹیلیویژن کے دو مرکز ہیں۔ ایک آرامکو کے ہیڈ کوارٹر میں اور دوسرا ایرپورٹ پر۔ ایرپورٹ کے پروگرام صرف انگریزی میں ہوتے ہیں اور آرامکو کے انگریزی اور عربی دونوں میں۔ یہ پروگرام صرف علمی اور معلوماتی ہی نہیں ہوتے، بلکہ ان میں ہر طرح کے پروگرام شامل ہوتے ہیں۔ عرب نوجوانوں پر، جن کے پاس پیسہ بھی وافر ہے اور وقت بھی فالتو ہے اور ان پر اخلاقی لحاظ سے بھی کوئی پابندی نہیں ہے، ان پروگراموں کا جو اثر ہوتا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ الامر بالمعروف والنہی عن المنکر والے سینما پر تو پابندی لگا سکتے ہیں اور واقعی انہوں نے یہ پابندی لگائی ہوئی ہے۔ چنانچہ کمپنی کے پورے علاقہ میں کوئی سینما نہیں ہے۔ لیکن ٹیلیویژن سے عرب نوجوانوں میں جو مغربی تہذیب کی تقلید کے بُرے اثرات پھیلتے ہیں، ان کی روک تھام کیسے ہو سکتی ہے؟

چائے کے بعد ہم لوگ ہوٹل آ گئے اور وہیں مولانا کے دیئے ہوئے وقت کے مطابق ۹ بجے

ڈاکٹر عبدالمجید حسن صاحب پہنچ گئے۔ انہوں نے مولانا سے دعا کے فلسفے کے متعلق سوالات کیے۔ مولانا نے ان کے سوالات کا تفصیل سے جواب دیا، جس سے ان کے ذہن کی الجھن پوری طرح تو نہیں، لیکن بڑی حد تک دور ہو گئی۔ ایک بجے رات تک بہت سے پاکستانی نوجوان مولانا کے پاس بیٹھے رہے اور مختلف علمی اور دعوتی موضوعات پر سوالات کرتے رہے۔ ڈیڑھ بجے کے قریب ہم لوگ سو سکے۔

آرام کو کی لائبریری | ۱۶ نومبر کو ہمارا پروگرام ایک تو بازار سے ضرورت کی چیزیں خریدنے کا تھا اور دوسرے آرامکو کی لائبریری دیکھنے کا۔ لائبریری پیشگی اجازت کے بغیر نہیں دیکھی جا سکتی، اس لیے راؤ اختر صاحب کو امیر کے سیکرٹری کے پاس بھیجا گیا تاکہ ہمارے لیے لائبریری دیکھنے کا انتظام کرا دیں۔ راؤ صاحب واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ دس بجے امیر کا ایک آدمی آئے گا اور ہمیں لائبریری لے جائے گا۔ ۹ بجے ہم خُبر گئے اور وہاں دیر تک بازار میں اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے رہے۔ ۱۰½ بجے مولانا راؤ اختر صاحب کے ساتھ لائبریری چلے گئے اور میں اور چودھری صاحب ساڑھے بارہ بجے تک بازار ہی میں رہے۔ خُبر کے بازاروں میں گھومنے سے ہمیں اندازہ ہوا کہ یہاں چیزیں بہت گراں ہیں، یعنی بحرین سے کم از کم دگنی۔ دکانداروں کی بکری خوب ہوتی ہے، کیونکہ کمپنی کے جو بھی امریکن، عرب یا دوسرے ملازمین ہیں، وہ سب یہیں سے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے ہیں اور پیسہ وافر ہونے کی وجہ سے گرانی کی کم ہی پروا کرتے ہیں۔ خُبر کے بازاروں میں ہمیں بہت ہی کم بے پردہ عورتیں گھومتی نظر آئیں۔ بے پردہ عورتیں یا تو امریکن تھیں یا کچھ شامی، فلسطینی، مصری اور لبنانی۔ یہ سب امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے ڈنڈے کا اثر ہے کہ کوئی مقامی عورت پردہ کے بغیر بازار میں نہیں نکل سکتی۔ امریکنوں پر تو خیر کوئی پابندی لگائی نہیں جا سکتی، البتہ پہلے شامی، فلسطینی، مصری اور لبنانی عورتوں پر بھی پردہ کی پابندی تھی۔ لیکن اب معلوم نہیں کیوں انہیں ڈھیل دے دی گئی ہے۔ حال میں اخبارات سے معلوم ہوا کہ اب بے پردہ عورتوں کا نکلنا ممنوع ہو گیا ہے۔

ظہر کے بعد ہم بھی مولانا کے ساتھ آرامکو کی لائبریری پہنچ گئے۔ آرامکو کی یہ ریسرچ لائبریری بہت ہی شاندار ہے۔ عرب اور مسلمان ملکوں کے متعلق جس نے جس زبان میں بھی جو کتاب لکھی ہے

وہ یہاں موجود ہے۔ خصوصاً جزیرہ عرب کے متعلق تو امریکنوں نے اتنی تحقیقات کی ہیں اور اس کے ایسے ایسے تفصیلی نقشے تیار کیے ہیں کہ ان کی مدد سے انہیں جزیرہ عرب کے متعلق جو معلومات حاصل ہیں وہ یقیناً خود عربوں کو بھی حاصل نہیں ہونگی۔ علاوہ ازیں ادب، تفسیر، حدیث، فقہ اور دوسرے اسلامی موضوعات کی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی اس لائبریری میں موجود ہے۔ مولانا دو گھنٹے تک لائبریری کی فہرست دیکھ کر اپنے مقصد کی کتابوں کے نام نوٹ کرتے رہے اور اس کے بعد ہم لوگ ہوٹل واپس آگئے۔

آرامکو کی یہ لائبریری جس عمارت میں واقع ہے، وہ آرامکو کا مرکزی دفتر ہے اور کئی منزلہ ہے۔ اس کی تعمیر فولاد سے ایسے طرز پہ کی گئی ہے کہ اس پر آگ یا زلزلہ کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ سُنا ہے کہ پوری لاگت جو اس پہ آئی ہے وہ ۵ ملین ڈالر یعنی تقریباً ۳ کروڑ روپے ہے۔ امریکن بظاہر سعودی حکومت اور سعودی ملازمین کی بڑی خاطر مدارات کرتا ہے اور موقع بے موقع ان کی نرم گرم بھی سہتا ہے، لیکن بالکل اس بنیے کی طرح جو اپنے گاہک یا قرضدار کی بڑی آؤ بھگت کرتا ہے لیکن اپنے مفاد سے نہیں چوکتا۔ امریکنوں نے اپنے پنجے سرزمینِ عرب میں کچھ اس زور سے گاڑے ہیں کہ وہ کبھی خود نکل جائیں تو نکل جائیں، نکالے سے نہیں نکل سکتے۔ عرب نوجوان جب ایک طرف آرامکو کے اس شاندار وسیع اور کسے ہوئے نظام کی طرف دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اپنی حکومت کے سروسامان اور نظام کو، تو ان کے دلوں میں امریکنوں کا رعب اور ان کی تہذیب کی برتری کا احساس شعوری اور غیر شعوری طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔

سفرِ ریاض ۱۷ نومبر کو ہمارا پروگرام ریاض روانہ ہو جانے کا تھا۔ ہم لوگ صبح جلدی اٹھے اور نماز کے بعد اپنا سامان باندھنے لگے۔ گاڑی کا وقت ۸ بجے کا تھا، لیکن ابھی ہم سامان باندھ ہی رہے تھے کہ ۷½ بجے کے قریب اسماعیل خاں صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ ہفوف کے قریب ریل کی پٹری خراب ہو گئی ہے، اس لیے گاڑی ۸ بجے کے بجائے ۱۰ بجے روانہ ہوگی۔ ۱۰ بجے پھر ٹیلیفون آیا کہ ابھی پٹری ٹھیک نہیں ہوئی اس لیے گاڑی ۱۲ بجے روانہ ہوگی۔ ۱۲ بجے اطلاع آئی کہ ابھی پٹری

خراب ہے۔ گاڑی ۳ بجے روانہ ہو گی۔ ۳ بجے آخری اطلاع آئی کہ آج گاڑی روانہ ہی نہ ہو گی ہم نے محض انتظار میں شام تک ہوٹل ہی میں وقت گزارا۔ مغرب سے پہلے ہم ظہران ریلوے سٹیشن گئے۔ وہاں اسٹیشن والوں نے بتایا کہ کل گاڑی کے روانہ ہونے کا امکان ہے، اس لیے آپ لوگ صبح ۷ بجے پتہ کریں۔

یہاں کی گاڑیوں کا نظم بھی خوب ہے۔ دمام سے ریاض تک صرف دو گاڑیاں جاتی ہیں: ایک ایرکنڈیشنڈ، جس کے تمام ڈبے فسٹ کلاس ہی کے ہوتے ہیں اور ۸ گھنٹے میں ریاض پہنچتی ہے۔ (دمام اور ریاض کے درمیان ۲۷۰ میل کا فاصلہ ہے)۔ یہ ہفتہ میں صرف تین دن یعنی ہفتہ، منگل اور جمعرات کو چلتی ہے۔ دوسری پسنجر جو ایرکنڈیشنڈ نہیں ہوتی اور ۱۴ گھنٹے میں ریاض پہنچتی ہے یہ بھی ہفتہ میں صرف تین یا چار دن چلتی ہے۔ گاڑیوں کے روانہ ہونے کے دن اور اوقات اگرچہ مقرر ہیں، لیکن کسی گاڑی کے متعلق یہ قطعی نہیں ہے کہ وہ اپنے مقرر دن اور وقت پر روانہ ہو ہی جائے گی۔ ہر چیز قابلِ تغیر ہے۔ کچھ ایسا ہی حال یہاں کے ہوائی جہازوں کا بھی ہے، اس لیے ہمارے پاکستانی احباب نے ان کا نام "یمکن ایرلائنز" اور "یمکن ریلویز" رکھا ہوا ہے اور سعودی باشندے بھی بعض اوقات انہیں ان ہی ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گاڑی یا ہوائی جہاز کے لیٹ ہونے کی صورت میں جب ان کے ذمہ دار حضرات سے دریافت کیا جاتے کہ گاڑی یا ہوائی جہاز کی روانگی کب ہو گی تو وہ کہیں گے "یمکن بعد نصف ساعة، یمکن بعد ربع ساعة، یمکن بعد ساعة"، لیکن یہ ساعہ ہے کہ اس کا ربع اور نصف بھی بعض اوقات کئی کئی گھنٹے لمبا ہو جاتا ہے۔ گذشتہ سفر میں اس 'یمکن' نے ہمیں دمشق کے ہوائی اڈہ پر چھ گھنٹے تک روکے رکھا۔ نہ ہم ہوائی اڈہ سے شہر جا سکتے تھے اور نہ ہوائی جہاز کے روانہ ہونے کی نوبت آتی تھی۔

۱۸ نومبر کی صبح ہم اٹھے، تو معلوم ہوا کہ گاڑی کے روانہ ہونے کا آج بھی امکان نہیں ہے اس لیے ہم آرام سے اپنا کام کرتے رہے، لیکن ½۹ بجے کے قریب یکایک اطلاع آئی کہ گاڑی آج ۱۱ بجے ظہران سٹیشن سے روانہ ہو گی۔ ½۱۰ بجے ہم سٹیشن پہنچ گئے، لیکن گاڑی ۱۲ بجے سے پہلے روانہ نہ ہو سکی

۱/۲ ۱۱ بجے کے قریب امیر سعود بن جلوی کے سیکرٹری صاحب آئے اور انہوں نے ہمارے لیے تین سیٹیں ریزرو کرادیں اور ہم سے کہا کہ یہاں سے ریاض اطلاع کر دی گئی ہے۔ آپ لوگ ریاض پہنچ کر سٹیشن سے سیدھے دارالضیافۃ الملکیہ (شاہی مہمان خانہ) چلے جائیں" گاڑی چار ڈبوں پر مشتمل اور ہمارے ہاں کی ریل کاروں سے مشابہ تھی اور پوری کی پوری ایر کنڈیشنڈ تھی صحراء میں ایر کنڈیشنڈ ڈبے بڑی ہی نعمت ہیں۔ ورنہ یہاں گرد اتنی اڑتی ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں آدمی کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ ایک بجے کے قریب ہم ابقیق پہنچے ا سٹیشن پر ۲۰ کے قریب پاکستانی احباب مولانا کو الوداعی سلام کہنے کے لیے موجود تھے۔ ۲ بجے کے قریب ہم ہفوف پہنچے، جو کبھی اس منطقہ شرقیہ کا صدر مقام تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہمیں یہ بہت بڑا اور نہایت ہی خوبصورت اور شاداب شہر نظر آرہا تھا کئی میل تک نخلستان کا سلسلہ تھا۔ ۵ بجے تک ہم ہفوف ہی پر رکے رہے، کیونکہ آگے ریل کی پٹری خراب تھی اور اس کی مرمت ہو رہی تھی۔ ۵ بجے ہفوف سے روانہ ہوئے، لیکن ۶ بجے اس مقام پر جا کر رک گئے جہاں پٹری کی مرمت ہو رہی تھی۔ مرمت بڑے زور شور سے ہو رہی تھی، کیونکہ اگلے روز ۱۹ نومبر کو شاہ سعود دمام جانے کے لیے یہاں سے گزرنے والے تھے مختلف سٹیشنوں پر ان کے استقبال کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔ اگر شاہ سعود کو یہ سفر نہ کرنا ہوتا تو معلوم نہیں مرمت میں کتنے دن لگ جاتے اور ہمیں کتنے دن اور خبر میں رکے رہنا پڑتا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اس مقام سے گاڑی چل دی۔ اس کے بعد معلوم نہیں کون کون سٹیشن آئے ہمیں صرف حرض اور خرج کا علم ہو سکا، لیکن اندھیرے میں انہیں بھی نہ دیکھ سکے۔ رات کے ایک بجے جب ریاض پہنچے تو بھوک نے سخت پریشان کر رکھا تھا چلتے وقت ہم نے لوگوں سے دریافت کیا تھا کہ کیا گاڑی میں کھانا مل جاتا ہے؟ انہوں نے ہاں میں جواب دیا تھا۔ اس لیے ہم نے اپنے ساتھ کھانے کے لیے کوئی چیز نہ لی تھی لیکن گاڑی میں پہنچ کر دیکھا کہ صرف ایک چھوٹی سی دکان ہے جس پر صرف چائے اور توس مل سکتے ہیں۔ چائے بھی دکاندار نے ایک تھرماس میں ڈال رکھی تھی۔ چند پیالیاں تھیں فوراً ختم ہو گئیں۔ دوپہر کو جب ہمیں بھوک لگی تو دو دو توس لیکر کھا لیے، لیکن شام کو اور رات کو وہ بھی نہ مل سکے ملگمری اسٹیشن سے گزرتے وقت شیخ محمد امین صاحب نے مولانا کی خدمت میں اپنی فیکٹری کے بسکٹوں کے کچھ ڈبے پیش کیے تھے یہ بسکٹ یہاں کام آئے انہیں کھا کر پانی پی لیا۔ لیکن ان سے بھوک تو ختم نہ ہو سکتی تھی۔ بہرحال صحیح سلامت پہنچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور سٹیشن سے دار الضیافہ پہنچنے کی فکر کرنے لگے۔

رسائل و مسائل

چند احادیث کے اشکالات اور انکی توضیح

سوال - ایک عرصہ سے دو تین چیزیں میرے دماغ پر بوجھ بن رہی ہیں۔ اس لیے مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

(۱) بخاری شریف کی تیسری حدیث میں نزول وحی اور حضور کی کیفیات کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ وحی کی ابتدا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اضطراب طاری ہو گیا تھا دریافت طلب یہ امر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام گھبرائے کیوں تھے؟ یہ بات کہ یہ رسالت کی ذمہ داریوں کے احساس کا نتیجہ تھا دل کو مطمئن نہیں کرتی، ورنہ ورقہ کے پاس لے جانے کے کوئی معنی نہیں بنتے بعض لوگوں کا یہ اشتباہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اس وقت اپنی رسالت کا کماحقہٗ وضوح نہیں ہوا تھا، کچھ بامعنی بات نہیں معلوم ہوتی۔ اگر یہ صحیح ہے تو جن کے پاس آپ یہ معاملہ لے کر گئے تھے کیا وہ ان کیفیات کے پس منظر کو حضور سے زیادہ جانتے تھے۔ ورقہ کے یہ الفاظ" ھذا الناموس الذی انزل اللہ علیٰ موسیٰ" اس امر کے مؤید ہیں کہ واقعی حضورؐ پر اپنی رسالت کا کماحقہٗ وضوح نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد صورتِ حال مزید مخدوش ہو جاتی ہے۔ صحیح صورتِ حال کیا ہے؟

(۲) باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ، حدیث نمبر ۱۲۲۶ میں صحابہ کی ارادتمندی اور عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے عروہؓ ذکر کرتے ہیں: فواللہ ما تنخم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نخامۃ الا وقعت فی کف رجل منھم فدلک بھا وجھہ وجلدہ "۔ نخامہ کھنکار کو بھی کہتے ہیں اور جو غلیظ مواد ناک سے نکلتا ہے اس کو بھی۔ ان میں سے جو بھی ہو بہرحال قابلِ غور ہے۔ کیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نخامہ کی یہ کیفیت نہیں ہوتی تھی جو عام طور پر ہوتی ہے؟

یا فرطِ عقیدت کی وجہ سے صحابہ کو اسے چہرے اور جسم پر مل لینے میں اجنبیت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ حضورؐ کی نظافت پسندی اس میں حائل کیوں نہ ہوئی؟

(۳) باب استعمال فضل وضوء الناس حدیث ۱۵۵ میں آتا ہے دعا النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقدح فیہ ماءٌ فغسل یدیہ ووجھہٗ فیہ ومجّ فیہ ثم قال لھما اشربا وافرغا علی وجوھکما ونحورکما۔ پانی کے برتن میں ہاتھ دھونا، پھر اس میں کلی کرنا، اور ان سب کے بعد لوگوں سے کہنا کہ اسے پیو اور اس سے منہ دھوؤ۔ یہ سب کچھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظافت پسندی کے عام کلیہ کے مخالف معلوم ہوتا ہے۔ پھر صحابہ کا اس سلسلہ میں بے خود ہو کر اس کو استعمال کرنا اور بھی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت مطلوب ہے۔

اقبال اور حدیث

(۴) اقبال مرحوم کو پاکستان میں قبولِ عام حاصل ہے۔ بالخصوص جدید طبقہ میں، اور اسی طبقہ میں پرویزی حضرات بھی گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہ لوگ یہ مشہور کر رہے ہیں کہ اقبال بھی منکرِ حدیث تھا۔ صحیح صورتِ حال کیا ہے؟ انگریزی خطبات میں مرحوم نے جن مآخذ کا ذکر کیا ہے، ان میں حدیث کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کی تفصیل اور توضیح میں جن نکات کا مرحوم نے ذکر کیا ہے ان سے مرحوم کا اپنا نظریہ منکرینِ حدیث کی حوصلہ افزائی کا موجب سا بن گیا ہے"۔

جواب: آپ نے جو سوالات کیے ہیں ان کا مختصر جواب حاضرِ خدمت ہے۔

(۱) نزولِ وحی کی کیفیت کو ٹھیک سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اچانک اس صورتِ حال سے سابقہ پیش آیا تھا۔ آپ کو اس سے پہلے کبھی یہ گمان بھی نہ گزرا تھا کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ نہ اس کی کوئی خواہش آپ کے دل کے کسی گوشے میں موجود تھی۔ نہ اس کے لیے آپ پہلے سے کوئی تیاری کر رہے تھے اور اس کے متوقع تھے کہ ایک فرشتہ اوپر سے پیغام لے کر آئے گا۔ آپ خلوت میں بیٹھ بیٹھ کر مراقبہ

اور عبادت ضرور فرماتے تھے لیکن نبی بنائے جانے کا کوئی تصور آپ کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا اس حالت میں جب یکایک غار حرا کی اس تنہائی میں فرشتہ آیا تو آپ کے اوپر فطرۃً اس پہلے عظیم اور غیر معمولی تجربے سے وہی گھبراہٹ طاری ہوئی جو لامحالہ ایک بشر پر طاری ہونی ہی چاہیئے قطع نظر اس سے کہ وہ کیسا ہی عظیم الشان بشر ہو۔ یہ گھبراہٹ بسیط نہیں بلکہ مرکب نوعیت کی تھی۔ طرح طرح کے سوالات حضور کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے جنہوں نے طبع مبارک کو سخت خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیا واقعی میں نبی ہی بنایا گیا ہوں؟ کہیں مجھے کسی سخت آزمائش میں تو نہیں ڈال دیا گیا ہے؟ یہ بارِ عظیم آخر میں کیسے اٹھاؤں گا؟ لوگوں سے کیسے کہوں کہ میں تمہاری طرف نبی مقرر ہوا ہوں؟ لوگ میری بات کیسے مان لیں گے؟ آج تک جس معاشرے میں عزت کے ساتھ رہا ہوں، اب لوگ میرا مذاق اڑائیں گے اور مجھے دیوانہ کہیں گے۔ اس جاہلیت کے ماحول سے آخر میں کیسے لڑ سکوں گا؟ غرض اس طرح کے نہ معلوم کتنے سوالات ہونگے جو آپ کو پریشان کر رہے ہوں گے۔ اسی وجہ سے جب آپ گھر پہنچے تو کانپ رہے تھے۔ جاتے ہی فرمایا کہ مجھے اڑھا دو، مجھے اڑھا دو۔ گھر والوں نے آپ کو اڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا دل ٹھیرا تو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سارا واقعہ سنایا اور فرمایا لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي "مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے"۔ انہوں نے آپ کو اطمینان دلایا کہ کلا واللہ ما یحزنک اللہ ابدا۔ انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق "ہرگز نہیں، خدا کی قسم آپ کو اللہ کبھی رنج نہ دیگا۔ آپ تو رشتہ داروں کے کام آتے ہیں بیکسوں کی مدد کرتے ہیں، نادار کی دستگیری کرتے ہیں، مہمان کی تواضع کرتے ہیں اور تمام نیک کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں"۔ پھر وہ ورقہ بن نوفل کے پاس آپ کو لے گئیں، کیونکہ وہ اہل کتاب میں سے تھے اور انبیائے سابقین کے حالات سے باخبر تھے۔ انہوں نے حضور سے کیفیت سن کر بلاتامل تصدیق کی کہ "یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پر آیا تھا"۔ اس لیے کہ وہ بچپن سے لیکر جوانی تک آپ کی انتہائی پاکیزہ سیرت سے خوب واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہاں

پہلے سے نبوت کے دعوے کی کسی تیاری کا شائبہ تک نہیں پایا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں کو جب انہوں نے اس واقعہ سے ملایا کہ یکایک غیب سے ایک ہستی آکر ایسے شخص کو ان حالات میں وہ پیغام دیتی ہے جو عین تعلیماتِ انبیاء کے مطابق ہے تو یہ ضرور سچی نبوت ہے۔

یہ سارا قصہ ایسا فطری اور معقول ہے کہ اس صورتِ حال میں یہی کچھ ہونا چاہیے تھا۔ اس پر شکوک کا پیدا ہونا تو درکنار، میرے نزدیک تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی صادق ہونے کے اہم ترین دلائل میں سے ایک ہے۔ اگر یہ معاملہ اس طرح پیش نہ آتا اور آپ یکایک حرا سے آتے ہی بڑے اطمینان کے ساتھ فرشتے کی آمد کا واقعہ مجمع عام میں سنا کر اپنی نبوت کا دعویٰ پیش فرماتے تو ایک آدمی یہ شک کر سکتا تھا کہ حضرت پہلے سے اپنے آپ کو نبوت کا اہل سمجھے بیٹھے تھے اور دور ایک غار میں بیٹھ بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہے تھے کہ کب کوئی کشف و الہام ہوتا ہے۔ آخر شدتِ مراقبہ نے ذہن کے سامنے ایک فرشتے کا نقشہ پیش کر ہی دیا اور کانوں میں آوازیں بھی آنے لگیں، معاذ اللہ۔ لیکن خدا کے فضل سے وہاں نبوت کا ارادہ اور اس کی خواہش اور کوشش تو درکنار، جب بالفعل وہ مل گئی تب بھی چند ساعتوں تک عالم حیرت ہی طاری رہا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ بے نظیر شخصیت کے مالک ہونے پر بھی وہ ذات عُجب و خود پسندی سے اس درجہ خالی تھی کہ جب نبوت کے منصب عظیم پر یکایک مامور کر دیئے گئے اس وقت بھی کافی دیر تک یہ اطمینان نہ ہوتا تھا کہ دنیا کے کروڑوں انسانوں میں سے تنہا ایک میں ہی اس قابل ہوں کہ اس منصب کے لیے رب کائنات کی نگاہِ انتخاب میرے اوپر پڑے۔

(۲) دوسرے نمبر پر آپ نے جس واقعہ پر تعجب کا اظہار کیا ہے، وہ درحقیقت کسی تعجب کا محل نہیں ہے۔ بس ذرا اس امر پر غور کر لیجیے کہ معاملہ ایک نبیؐ کا ہے اور ان لوگوں کا ہے جو سچے دل سے مان چکے تھے کہ حضور نبی ہیں اور اپنے درمیان اس عظیم المرتبت ہستی کو موجود پا رہے تھے۔ اس مرتبے کی ہستیوں کا جو زبردست اثر ان لوگوں پر ہو سکتا ہے، جنہیں یقین ہو کہ ہمارے سامنے وہ شخص موجود ہے جسے اللہ سے مکالمہ کا شرف حاصل ہوتا ہے، اس کا اندازہ

آپ بخوبی کر سکتے ہیں اگر تھوڑی دیر کے لیے خود اپنے آپ کو ان لوگوں کی جگہ فرض کریں۔ یہ انبیاء کا غیر معمولی اثر ہی تو تھا جس کی بدولت ان کے معتقدین میں سے بکثرت لوگ حد پر نہ رک سکے اور غلو کر کے انہیں خدا اور ابن اللہ اور اوتار اور نہ معلوم کیا کیا بنا بیٹھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں لوگوں کو حد اعتدال پہ قائم رکھنے کے لیے جو کوششیں فرمائیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ مگر اس کے ساتھ آپ نے انسانی فطرت کی رعایت بھی ملحوظ رکھی اور حدِ اعتدال کے اندر جہاں تک شدتِ عقیدت کو جانے کی اجازت دی جا سکتی تھی وہاں تک جانے سے لوگوں کو نہیں روکا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت لوگوں نے حضور کا تھوک زمین پر نہ گرنے دیا اور آگے بڑھ کر اسے ہاتھوں پر لینے اور اپنے منہ اور جسم پر مل لینے کی کوشش کی تو آپ نے منع نہ فرمایا۔ رہی یہ بات کہ خود لوگوں کو گھن کیوں نہ آتی تھی، تو میں کہوں گا کہ عام انسانوں کے تھوک سے تو ضرور گھن آسکتی ہے، مگر جس منہ پر خدا کا کلام اترتا ہو اس کے تھوک سے گھن آنا تو درکنار، اہلِ ایمان کی نگاہ میں تو عطر کی بھی اس کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

(۳) تیسرے واقعہ کی نوعیت بھی وہی ہے جو اوپر کے واقعہ کی ہے۔ لیکن اس کی پوری تفصیل جو بخاری کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف میں آئی ہے، اگر نگاہ میں رہے تو وہ بات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے جو اوپر میں نے بیان کی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ حضورؐ نے غزوۂ حنین کے غنائم بر سرِ موقع تقسیم کرنے کے بجائے جعرانہ پہنچ کر تقسیم کرنے کا فیصلہ فرمایا تھا اور اس کی وجہ سے بعض نئے نئے ایمان لاتے ہوئے لوگ بڑے بے صبر ہو رہے تھے۔ جب آپ جعرانہ پہنچے تو ایک بدو نے آکر اپنے حصے کا مطالبہ کیا۔ حضورؐ نے فرمایا "تجھے بشارت ہو" (یعنی اس بات کی بشارت کہ عنقریب حصے تقسیم ہوں گے اور اب تک جو تو نے صبر کیا اس کا اجر ملیگا)۔ اس نے ترخ کر کہا "آپ کی یہ بشارتیں میں بہت سن چکا ہوں"۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت بلالؓ اس وقت حاضر تھے۔ حضورؐ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا "اس نے میری بشارت رد کر دی۔ تم دونوں اسے قبول کرو"۔ دونوں نے عرض کیا "ہم نے قبول کی"۔ پھر

آپ نے ایک پیالہ بھر پانی منگایا۔ اس میں ہاتھ اور منہ دھویا اور کلّی کی پھر دونوں صاحبوں سے فرمایا تم اسے پی لو اور اپنے منہ اور سینے پر ڈالو اور بشارت لو۔ چنانچہ دونوں نے ایسا ہی کیا۔ پردے کے پیچھے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ بیٹھی تھیں۔ انہوں نے پکار کر دونوں صاحبوں سے کہا کچھ اپنی ماں کے لیے بھی بچا لینا۔ یہ سن کر انہوں نے تھوڑا سا پانی بچا لیا اور انہیں بھی دیا۔

اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور دراصل اس بدو کو یہ سبق دینا چاہتے تھے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس نے جو اس بے بہا بشارت کو رد کیا ہے، یہ کیسی ناشکری اور بدبختی ہے، اور سچے اہلِ ایمان کا اپنے نبی کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت کا انداز اور پھر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا اس پانی میں سے اپنا حصہ طلب کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہ حضرات اس مبارک پانی کو لے کر پینے اور منہ اور سینہ پر ملنے میں کراہت محسوس کرنا تو درکنار اسے اپنے لیے آبِ حیات سمجھتے تھے، اس کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ کر مسابقت کرتے تھے، اور انہیں فخر تھا کہ یہ نعمت انہیں نصیب ہوئی۔

(۴) "اقبال اور حدیث" والے سوال کے بارے میں مَیں صرف اتنا ہی کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے اس مسئلے کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں ہے کہ حدیث کے متعلق اقبال مرحوم کا نظریہ کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ اگر ہمارے پاس اس معاملہ میں صاف اور واضح نصوص اور خلفاء راشدین سے لے کر آج تک کے تمام علمائے امت کا متفقہ طرزِ عمل نہ ہوتا تو شاید ہم اس کے محتاج ہوتے کہ حدیث کے متعلق علامہ اقبالؒ کا نظریہ معلوم کرتے۔ لیکن ان حجتوں کی موجودگی میں یہ چیز تلاش کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

اسلام اور طبّی تعلیم و تربیت

سوال: میں میڈیکل کالج کا طالب علم ہوں۔ ایک اہم مسئلہ میں آپ کی رائے درکار ہے۔

امید ہے کہ تشفی جواب دے کر ممنون فرمائیں گے۔

میڈیکل کالج میں داخلہ کے بعد دو سال تک تو ہمیں صرف ANATOMY (علم تشریح) اور PHYSIOLOGY (علم الافعال) پڑھنا پڑتا ہے۔ اس لیے ان دو سالوں میں ایک طالب علم کو صرف مردہ جسموں کی چیر پھاڑ (DISSECTION) کرنی پڑتی ہے۔ مگر تھرڈ ایر میں آنے کے بعد طب پڑھائی جاتی ہے اور دواخانوں وغیرہ میں عملی کام کرنا پڑتا ہے۔ اس دوران میں مجھے چند تلخ تجربات سے دوچار ہونا پڑا جن سے طبیعت کافی کراہت محسوس کرتی ہے

اپنی تعلیم کے دوران میں ہمیں مریض عورتوں کو چھونا پڑتا ہے اور کبھی کبھی ان عورتوں کے پوشیدہ اعضاء کا امتحان بھی کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے لیے ایک مضمون دایہ گری (MIDWIFERY) سے متعلق ہوتا ہے جس کے امتحان کے لیے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی بیس زچگیوں (DELIVERIES) کے بارے میں مکمل رپورٹ پیش کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ امتحان میں بھی ایک مریض عورت دی جاسکتی ہے (معاینہ وغیرہ کے لیے) اس صورت میں اس کے تمام اعضا کا امتحان کرنا پڑتا ہے ___ ظاہر ہے کہ ایک نوجوان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ عورت کے لمس کے بعد بھی اس کے صنفی جذبات میں انتشار نہ پیدا ہو۔ اگرچہ میں اب اپنے آپ پر کافی کنٹرول حاصل کر چکا ہوں مگر پھر بھی میرا ضمیر کبھی کبھی ملامت کرنا شروع کر دیتا ہے اور میرے لیے یہ احساس کافی اذیت ناک ہوتا ہے کہ میں آنکھ کے زنا کا مرتکب ہو رہا ہوں مگر ظاہر ہے یہاں غضِ بصر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ___ براہ کرم یہ بتایئے کہ ان حالات میں ایک صالح نوجوان کو کیا کرنا چاہیے؟

ہو سکتا ہے کہ ایک حکیم صاحب کے لیے یہ ممکن ہو کہ محض مریض کی نبض پر ہاتھ رکھ کر یا اس کی آواز ہی سن کر پورے مرض کا پتہ چلا سکیں مگر بعض بیماریوں کی تشخیص اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ مریض کے سارے اعضاء کا تفصیلی معاینہ وامتحان نہ کیا جائے۔ اس لیے ایک ڈاکٹر کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ دونوں ہی جنسوں کے افعال (PHYSIOLOGY)

اور اشکال (ANATOMY) کے بارے میں تفصیلی علم رکھے اور بعض حالات میں مریض یا مریضہ کے ان اعضاء کا امتحان بھی کرے جو ستر کی حدود میں داخل ہیں۔

میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ ایک اسلامی حکومت عورتوں اور مردوں کے لیے میڈیکل کالجس الگ الگ قائم کر سکتی ہے اور عورتوں کو صرف عورتوں ہی کے امراض و علاج کے بارے میں تعلیم دے سکتی ہے مگر آج جبکہ اسلامی حکومت عملاً قائم نہیں ہے، کیا پیشۂ طب صرف اسی لیے حرام سمجھا جائے گا کہ اس کے حصول کے دوران میں جنسِ مخالف کے جسم کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے؟ اگر ایسا ہو تو کیا ہم اپنی مریض خواتین کو صرف غیر مسلم ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے؟ براہِ کرم اپنی موقر رائے سے مطلع فرمایئے۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد اپنے فن کو رضائے الٰہی کا ذریعہ بنانے کے بارے میں میں نے کتنے حسین خواب دیکھے ہیں — مگر، اگر میرا یہ فعل یعنی موجودہ حالات میں حصولِ علم طب کبائر میں داخل ہو اور میرا ذہن واقعی اسے گناہ کبیرہ تسلیم کرے تو انشاء اللہ میں اپنے آپ کو میڈیکل کالج چھوڑ دینے پر مجبور کر دوں گا۔"

جواب: آپ کا مفصل خط ملا۔ پڑھ کر اس بات پر دلی مسرت ہوئی کہ ابھی ہمارے نوجوانوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کو جدید تعلیم و تہذیب کے اثرات نے خدا سے غافل اور اس کے حدود سے بے پروا نہیں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو راہِ راست پر ثبات و استقامت بخشے اور آپ کی رہنمائی و نگہبانی فرمائے۔

جس مسئلے میں آپ نے مجھ سے استفسار کیا ہے وہ درحقیقت ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس میں حرمت اور اباحت کی حدیں آکر خلط ملط ہو گئی ہیں۔ ایک طرف شریعت یہ جائز نہیں رکھتی کہ کوئی شخص اپنا ستر دوسرے کے سامنے کھولے اور دوسرا اسے دیکھے، اور خصوصاً عورت کا ستر کسی مرد کے سامنے کھلنا اور مرد کا نہ صرف اسے دیکھنا بلکہ چھونا اور بغور اس کا معاینہ کرنا تو شریعت کی نگاہ میں سخت قبیح ہے۔ لیکن دوسری طرف اللہ کی شریعت نے انسانی زندگی کی

ضروریات کا بھی لحاظ کیا ہے، جن میں سے ایک بڑی اہم ضرورت علاجِ امراض ہے۔ اس علاج کی خاطر ناگزیر ہے کہ طبیبوں اور طبیبات، دونوں ہی کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ مردوں اور عورتوں دونوں کا علاج کرنے کے قابل ہو سکیں، کیونکہ انسان کو ایسے حالات پیش آ سکتے ہیں جن میں ایک عورت کا علاج کسی مرد طبیب کو، اور ایک مرد کا علاج کسی عورت طبیبہ کو کرنا پڑ جائے اور یہ لازم نہیں ہے کہ ہمیشہ ہر حال میں، مردوں کو مرد ہی طبیب اور عورتوں کو عورت ہی طبیبہ مل سکے۔ یہ چیز اس بات کی مقتضی ہے کہ اس حرمت کو بضرورت مباح کیا جائے۔ البتہ اس طرح کی تمام اباحتوں میں یہ قاعدۂ شرعیہ ملحوظ رہنا ضروری ہے کہ ان سے صرف بوقت ضرورت اور تا بحد ضرورت کام لیا جائے اور انہیں مطلقاً مباح سمجھ کر حرمت کی ساری حدیں نہ توڑ دی جائیں۔

یہ تو ہے تعلیم طب کے معاملہ میں آپ کے سوال کا جواب۔ رہا ہسپتالوں کا معاملہ، تو شرعی نقطۂ نظر سے مخلوط ہسپتال بالکل غلط ہیں۔ مردوں کے لیے الگ ہسپتال ہونے چاہییں جن میں ڈاکٹر، نرس، ڈسپنسر وغیرہ سب مرد ہوں۔ اور عورتوں کے لیے زنانہ ہسپتال ہونے چاہییں جن میں عورتیں ہی ڈاکٹر، نرس اور ڈسپنسر ہوں۔ عورتوں کا علاج مردوں سے، یا مردوں کا علاج عورتوں سے کرانا، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ علاج کی خاطر ستر کھولنا ناگزیر ہو، صرف اس صورت میں جائز ہے جبکہ اس کے سوا چارہ نہ ہو۔ اسے عام قاعدہ کسی حال میں نہیں بنا لینا چاہیے۔

تعلیم کے معاملے میں بھی مخلوط میڈیکل کالج قابلِ اعتراض ہیں۔ زنانہ میڈیکل کالج قائم کرنا جب ممکن ہے اور اس کے لیے اسباب فراہم ہو سکتے ہیں تو آخر کیوں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ طبی تعلیم دی جائے؟ طبی تعلیم کی نوعیت جیسی کچھ ہے اس میں لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ساتھ پڑھنا تو دونوں میں حیا کی رمق بھی باقی نہیں چھوڑتا۔

تعارفِ کتب

پاکستان کے معاشی مسائل (بزبانِ انگریزی) تالیف: سید عنایت حسین صاحب ۔ ایم اے (معاشیات)، (آرنلڈ گولڈ میڈل)

اس کتاب کے فاضل مصنّف علمِ معیشت سے بڑی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ آلو کی فصل کے متعلق ان کے مختلف مضامین جو بعض اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں اُن کے مطالعہ سے اُن کی ذہانت اور تبحرِ علمی کا باسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی اور صرف معاشیات کے طلبا تک محدود رہی۔ گذشتہ سال صدر محترم کی گراں قدر رائے نے اس فاضلانہ تصنیف کو ملک کے اندر اور باہر ایک نہایت اونچا مقام عطا فرمایا ہے۔ اس تصنیف میں مقدمہ کے علاوہ ۲۳ ابواب ہیں، جن میں پاکستان کے معاشی مسائل پر بڑی شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے۔

پاکستان کی معیشت کے بارے میں اُردو اور انگریزی میں کئی ایک کتابیں موجود ہیں لیکن اس کتاب کو ان سب پر اس وجہ سے امتیاز حاصل ہے کہ اس میں پاکستان کے فکری پس منظر سے بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ہماری معاشی ترقی کی راہ میں ہمارے بعض اساسی افکار و تصوّرات حائل ہیں۔ اس لیے جب تک ان کے اندر کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں کی جاتی اہلِ پاکستان کی خوشحالی حکایتِ تشنہ و سراب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

کتاب کے فاضل مصنّف بالکل آغاز ہی میں ہماری قومی زندگی میں معاشیات کی اہمیت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں تو اس سے بھی تجاوز کر کے یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ اسلام کے احیا کے لیے کوئی تحریک بھی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ مسلمانوں کی معاشی

نقطۂ نظر سے تعمیرِ نو نہ کی جائے ۔اس کے بغیر نہ تو اُن کے ایمان میں ثبات پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی اُن کے اعمال کو غیر متزلزل بنیادیں فراہم ہو سکتی ہیں ۔" (صفحہ ۱۱۱)

اس مقصد کے حصول کے لیے وہ جس تدبیر کی نشاندہی کرتے ہیں وہ یہ ہے :

"معاشی مسائل کو صرف معاشی قوانین کی مدد سے ہی حل کیا جائے کیونکہ مذہب سے ان کا انسلاک دونوں کے لیے ضرر رساں ثابت ہوتا ہے ۔"

ہم یہاں اس بحث میں نہیں پڑتے کہ جناب عنایت حسین صاحب کا یہ قول کہاں تک درست ہے اور بڑے بڑے معیشت دان مثلاً مارشل، پیگو اور لارڈ کینیز اس نظریہ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں ۔ہم اس سلسلہ میں خود اُن کی اپنی تصریحات ہی نقل کرتے ہیں ۔

کتاب کے صفحہ چالیس پر اسلام اور معیشت کے عنوان کے تحت وہ رقمطراز ہیں :

" دنیا کے بیشتر مذاہب کے برعکس اسلام اپنے ماننے والوں کو زندگی کے روزمرہ کاروبار میں جس میں معاشی اور معاشرتی سرگرمیاں بھی شامل ہیں، شرکت کی پوری پوری آزادی عطا کرتا ہے ۔انہیں اس بات کی بھی اجازت دیتا ہے کہ وہ اخلاقی حدود وغیرہ کے اندر رہ کر اپنی فطری احتیاجات کو پورا کریں ۔"

فکر و نظر کا یہ تضاد ایسا ہے جسے ہم دُور کرنے کی قطعاً اہلیت نہیں رکھتے ۔اس تضاد کی سب سے بڑی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ فاضل مصنف قوانینِ شرعی اور قوانینِ طبیعی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے ۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ تمام سائنٹفک قوانین جن کے تحت قدرت کا یہ کارخانہ ایک لگے بندھے ضابطے کے تحت چل رہا ہے وہ سارے کے سارے اسلامی ضوابط ہی ہیں اور صرف ان کی پیروی ہی سے اسلام کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے ۔یہ تصور اتنا غلط اور لغو ہے کہ اس سے دین کی پوری عمارت ہی منہدم ہو جاتی ہے ۔اگر اسلام صرف قوانینِ طبیعی کی پیروی کا ہی دوسرا نام ہے تو پھر دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور کتبِ سماوی کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی ۔انسانی ہدایت کے لیے اس نظریہ کی رو سے سائنس دان اور اُن کے انکشافات ہی کافی ہیں ۔

یہ چیز تو اسلام کی عین ضد ہے۔ دنیا میں جتنے انبیاء تشریف لائے ہیں انہوں نے نوعِ انسانی کو یہ بتایا ہے کہ قوانینِ طبیعی سے جو قوت و طاقت اسے حاصل ہوتی ہے اسے کس طرح قوانینِ شرعی کے اندر رہ کر استعمال کیا جائے۔

دورِ جدید میں جو زبردست انتشار نظر آ رہا ہے وہ صرف قوانینِ طبیعی کی بے قید پیروی کی وجہ سے ہی ہے۔ اور ایک مغربی مفکر کے بقول "اہلِ مغرب کو سائنس نے وہ قوت طاقت بخشی ہے جو دیوتاؤں کے شایانِ شان ہے مگر وہ اس سے سکول کے ناتراشیدہ بچوں کی طرح فائدہ اٹھا رہے ہیں"۔

ہمیں فاضل مصنف کا یہ نظریہ بھی کچھ عجیب و غریب سا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد یہاں کے لوگوں میں یاس و قنوطیت کے جو جذبات بڑی سرعت کے ساتھ پرورش پا رہے ہیں ان کا سبب معاشی ترقی کی سست رفتاری ہے۔ اس ملک میں معاشی استحکام کے لیے جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ کچھ زیادہ تشویشناک نہیں۔ یہاں اصل تکلیف دہ صورت جس نے لوگوں کو سخت مایوس کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے معاملے میں اس قوم کے ساتھ جو وعدے کیے گئے تھے انہیں پورا نہیں کیا گیا۔ اور یہی ہمارے نزدیک اس قوم کی بددلی کا حقیقی سبب ہے۔

فاضل مصنف نے کتاب کے چوتھے باب میں جن افکار و نظریات کا اظہار کیا ہے اور جو درحقیقت اُن کے نزدیک اس کتاب کی جان ہیں، اُن میں سے بھی اکثر و بیشتر سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

انہوں نے اپنی بحث اس غلط مفروضے پر اٹھائی ہے کہ مذاہب طبیعی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ ہندوستان کے طبیعی حالات پیش کرتے ہیں۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ اس بیم برِ اعظم کی شادابی نے لوگوں کو مختلف آستانوں پر جھکنے کے لیے آمادہ کیا۔ یہ تصور بڑا ہی غلط اور گمراہ کن ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہاں پہاڑوں، دریاؤں اور سبزہ زاروں کی کثرت نے بت پرستی کو جنم دیا ہے تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا چاہیے کہ عرب میں ان چیزوں

ضروریات کا بھی لحاظ کیا ہے، جن میں سے ایک بڑی اہم ضرورت علاجِ امراض ہے۔ اس علاج کی خاطر ناگزیر ہے کہ طبیبوں اور طبیبات، دونوں ہی کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ مردوں اور عورتوں دونوں کا علاج کرنے کے قابل ہو سکیں، کیونکہ انسان کو ایسے حالات پیش آ سکتے ہیں جن میں ایک عورت کا علاج کسی مرد طبیب کو، اور ایک مرد کا علاج کسی عورت طبیبہ کو کرنا پڑ جاتا ہے اور یہ لازم نہیں ہے کہ ہمیشہ ہر حال میں مردوں کو مرد ہی طبیب اور عورتوں کو عورت ہی طبیبہ مل سکے۔ یہ چیز اس بات کی مقتضی ہے کہ اس حرمت کو بضرورت مباح کیا جائے۔ البتہ اس طرح کی تمام اباحتوں میں یہ قاعدۂ شرعیہ ملحوظ رہنا ضروری ہے کہ ان سے صرف بوقت ضرورت اور تابحد ضرورت کام لیا جائے اور انہیں مطلقاً مباح سمجھ کر حرمت کی ساری حدیں نہ توڑ دی جائیں۔

یہ تو ہے تعلیم طب کے معاملہ میں آپ کے سوال کا جواب۔ رہا ہسپتالوں کا معاملہ، تو شرعی نقطۂ نظر سے مخلوط ہسپتال بالکل غلط ہیں۔ مردوں کے لیے الگ ہسپتال ہونے چاہییں جن میں ڈاکٹر، نرس، ڈسپنسر وغیرہ سب مرد ہوں۔ اور عورتوں کے لیے زنانہ ہسپتال ہونے چاہییں جن میں عورتیں ہی ڈاکٹر، نرس اور ڈسپنسر ہوں۔ عورتوں کا علاج مردوں سے، یا مردوں کا علاج عورتوں سے کرانا، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ علاج کی خاطر ستر کھولنا ناگزیر ہو، صرف اس صورت میں جائز ہے جبکہ اس کے سوا چارہ نہ ہو۔ اسے عام قاعدہ کسی حال میں نہیں بنا لینا چاہیے۔

تعلیم کے معاملے میں بھی مخلوط میڈیکل کالج قابلِ اعتراض ہیں۔ زنانہ میڈیکل کالج قائم کرنا جب ممکن ہے اور اس کے لیے اسباب فراہم ہو سکتے ہیں تو آخر کیوں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ طبی تعلیم دی جائے؟ طبی تعلیم کی نوعیت جیسی کچھ ہے اس میں لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ساتھ پڑھنا تو دونوں میں حیا کی رمق بھی باقی نہیں چھوڑتا۔

گئے ہیں . . . . ان کے بوسیدہ افکار و نظریات اُن کی گردنوں میں طوق بن کر لٹکے ہوئے ہیں اور وہ انہیں نئے اور ترقی یافتہ طریقوں کے اختیار کرنے سے ہمیشہ باز رکھتے ہیں۔ مذہب کے اصل سرچشموں سے اُن کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے۔ لیکن انہوں نے دوسری اقوام کی طرح اس بات کی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی کو قومیت کی بنیاد پر پھر سے تعمیر کریں۔ (ص ۴۲)

چند صفحات کے بعد بلی پوری طرح تھیلے سے باہر آجاتی ہے اور وہ بڑے واشگاف الفاظ میں فرماتے ہیں:

"اس بیماری کا علاج یہی ہے کہ امورِ دنیا کو دین سے یکسر الگ کر دیا جائے اور اُس پالیسی کو واضح طور پر اپنا لیا جائے جسے اتاترک نے ترکی میں اختیار کیا تھا۔"

جناب عنایت حسین صاحب کی اس پوری بحث کا مرکز و محور یہی نقطہ ہے اور اسی پر انہوں نے قوم کی توجہ منعطف کرانے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے وہ سارے ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں جو متجددین عام طور پر استعمال کرتے ہیں، یعنی اسلام کی جدید تعبیر پر زور، ملا کو گالیاں دینا، سرسید اور اتاترک کی بے پناہ تعریف و توصیف اور علامہ اقبال کے کلام سے ناجائز استفادہ۔

تبصرہ نگار نے علامہ اقبال مرحوم کی قریب قریب ساری تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے لیکن اسے بڑی تلاش و جستجو کے باوجود کہیں یہ نظر نہیں آیا کہ علامہ صاحب نے دین و سیاست کی جدائی کی تلقین کی ہو۔ انہوں نے تو ہمیشہ اسی بات پر زور دیا ہے: ع

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہم نے اس بات کا کھوج لگانے کی بھی پوری کوشش کی ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کونسے ایسے علماء تھے جنہوں نے امتِ مُسلمہ کو مغربی فلسفہ اور تاریخ اور مغربی ایجادات و انکشافات سے بے بہرہ رکھنے کی احمقانہ سعی کی۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں اس معاملے میں سخت ناکامی ہے۔

علمائے ربانی نے جس چیز کی مخالفت کی تھی، وہ مغربی علوم و فنون کا اکتساب نہ تھا بلکہ مغربی تہذیب و تمدن کی نقالی تھی اور یہ چیز آج بھی قوم کے لیے اتنی ہی مہلک ہے جتنی کہ آج سے سو برس پہلے تھی۔ مغربی تہذیب کے پرستار اس کی مدح میں جو چاہیں کہتے رہیں لیکن حالات نے علماء (اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے) کے اس موقف کو بالکل صحیح اور درست ثابت کیا ہے۔ یہ اسی مغربی تہذیب کی ذہنی غلامی کا نتیجہ ہے کہ کچھ لوگ یہاں بڑی بیباکی کے ساتھ مسلمانوں کو اپنا مقصدِ حیات تک تبدیل کر دینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

فاضل مصنف نے حکومت پاکستان کو ایک "سٹیٹ چرچ" کے قیام کا بھی مشورہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

"یہ وہ مناسب وقت ہے جب ہمیں ایک ایسا بورڈ قائم کرنا چاہیے جس میں آزاد اور جدید تصورات رکھنے والے علما کو شامل کیا جائے تاکہ وہ مولانا جلال الدین رومی، علامہ اقبال اور اتاترک کے نظریات کے مطابق اسلامی افکار کی تشکیلِ جدید کریں۔"

مولانا جلال الدین رومی اور علامہ اقبال کے نام تو محض اس مشن کو مقدس بنانے کی غرض سے شامل کیے گئے ہیں، ہدایت کا اصل منبع تو صرف اتاترک ہے۔ ہمیں ان تینوں کے افکار و نظریات کے درمیان کوئی قدرِ مشترک ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ ایک الجھا ہوا ذہن ہی ان تینوں کو جمع کر سکتا ہے

آخر میں ایک آدھ مثال مصنف کے طرزِ استدلال کی بھی ملاحظہ فرمائیں۔ وہ ایک مقام پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سیاسی قوت معاشی قوت ہی سے پیدا ہوتی ہے اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ عربی کی مشہور ضرب المثل الناس علی دین ملوکہم پیش فرماتے ہیں۔

کتاب کو دینِ محمدی پریس نے عمدہ طباعتی معیار کے ساتھ شائع کیا ہے۔

مطبُوعات

تحقیق قربانی | تالیف مولانا عبدالنبی کوکب۔ ناشر: مکتبہ ابناء الاسلام ۱۹ چیمبرلین روڈ لاہور۔ قیمت مجلد دو روپے۔ صفحات ۱۹۸۔

منکرینِ حدیث نے مسلمانوں کو جن مختلف مسائل پر اُلجھایا ہے اُن میں ایک قربانی بھی ہے۔ مسلمان چودہ سو برس سے اس سنتِ ابراہیمی کو مسلسل ادا کرتے چلے آرہے ہیں اور آج سے پیشتر کوئی ایک زبان بھی اس کے خلاف نہیں کھلی یہ ہمارے اس عہد کی خوبی ہے کہ کچھ لوگوں نے اب اس کے خلاف نہایت مکروہ قسم کا پروپیگنڈا شروع کیا ہے اور اسے دین سے خارج کرنے کی مذموم کوشش کی ہے مقامِ شکر ہے کہ علماءِ حق نے اپنی عظیم الشان روایات کے مطابق دوسرے اہم مسائل کی طرح اس پر بھی پوری پوری توجہ صرف کی ہے چنانچہ اسی موضوع پر گذشتہ تین چار سالوں میں کئی ایک رسالے اور کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی نوع کی ایک کامیاب کوشش ہے بلکہ بعض اعتبار سے تو یہ اُن سب کُتب پر فوقیت رکھتی ہے۔ فاضل مصنف نے عقلی اور نقلی دلائل سے معترضین کی خام خیالیوں کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان لوگوں کے ذہنوں میں سوائے مغرب کی مرعوبیت کے اور کوئی چیز نہیں۔ انھوں نے مسئلہ قربانی کے ہر پہلو کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مولانا کوکب نے آغاز میں جن احساسات کا اظہار کیا ہے وہ ایک صحیح طرزِ فکر کے آئینہ دار ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> "دین کی کسی عبادت میں انفرادی طور پر بعض مسلمانوں سے غفلت اور سستی کا واقع ہو جانا ایک الگ امر ہے لیکن اجتماعی طور پر مسلمانوں کا دین کی کسی حقیقت سے انکار کر دینا ایک بالکل دوسری بات ہے ظاہر ہے کہ پوری قوم کا شریعت کی ایک چھوٹی سی بات سے منحرف ہو جانا دنیا کی قوموں کو اس بات کا ثبوت بہم پہنچانا ہے کہ مسلمان بھی کھلم کھلا اپنے دین میں تحریف و تصرف کرتے ہیں ۔۔۔ جب ایک دفعہ یہ اصول بن گیا کہ بندے

اپنی صوابدید کے مطابق قربانی یا شریعت کے کسی دوسرے امر میں اس حد تک دخل اندازی کر سکتے ہیں کہ عبادت کی حدود کو بڑھانا اور کم کرنا اپنے اختیار میں لایا جا سکتا ہے تو کل کو اپنی ذاتی مرضی یا کسی قسم کے حالات کے پیشِ نظر ایک عبادت کو سرے سے ختم کرنے کا مرحلہ بھی آ کر رہے گا . . . . پھر اس امر کا کون ضامن ہے ؟ کہ اس قسم کی حد بندیاں صرف ایک عبادت تک ہی محدود رکھی جائیں گی اور دوسرے اسلامی ارکان ، اس دست برد سے محفوظ رہیں گے . . . . اسی طرح قربانی کے جانور کی بجائے کچھ رقم خیرات کرنا بھی دراصل قربانی کو ختم کرنا ہی ثابت ہو گا - اول تو یہ ہو گا کہ آہستہ آہستہ یہ پیسے جمع کرنے یا صدقہ کرنے کا سلسلہ بھی نرم ہوتے ہوتے ختم ہو کر ہی رہ جائے گا - اور اگر کسی جبر کے خطرے نے مسلمانوں میں اس متبادل خیرات کو جاری رکھ بھی لیا تو بھی اس قدر تو ظاہر ہے کہ قربانی بہ حیثیت اسمٰعیلی یادگار کے باقی نہ رہے گی اور کسی قوم کا اپنی محبوب ملی یادگاروں کو خود اپنے ہاتھوں سے مٹانا ملت کی تاریخ کے ساتھ دردناک مذاق کرنا ہے - خصوصاً جب کہ وہ یادگار خلوص و للہیت اور تقویٰ و طاعت کا ایک متوارث سرچشمہ ہو " (ص ۱۲-۱۳)

پوری کتاب اسی قسم کے صحیح افکار اور پاکیزہ احساسات و جذبات کی ترجمان ہے - قاری کو اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اسے بڑی عجلت میں لکھا گیا اور عجلت ہی میں کتابت و طباعت کے مراحل طے کیے گئے اس لیے اس میں کافی غلطیاں رہ گئی ہیں - مثال کے طور پر صفحہ ۱۰ پر نقطۂ نگاہ کی جگہ نکتہ نگہ درج ہو گیا ہے - کتاب کا معیارِ کتابت و طباعت بھی کچھ بہت اچھا نہیں - ان سب چیزوں کے باوجود کتاب ایک محققانہ تصنیف ہے اور اپنے لکھنے والے کے خلوص اور گہرے علم کی پوری طرح غمازی کرتی ہے اور دینی کتابوں کی فہرست میں ایک نہایت قابلِ قدر اضافہ ہے -

حیاتِ وحید الزماں | تالیف مولانا محمد عبدالحلیم چشتی - طابع و ناشر: نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارتِ کتب آرام باغ کراچی - قیمت ۴ روپے - صفحات ۱۶۵

"نور محمد، اصح المطابع" نے عربی کتب کو اردو میں منتقل کرانے اور پھر انہیں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کرنے میں دین کی جو بیش قیمت خدمت سرانجام دی ہے وہ پاک و ہند میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ شاید اسی نسبت سے انہوں نے ایک ایسے متبحر عالم کے سوانح حیات اور علمی کارناموں کا تذکرہ شائع کیا ہے جس نے نہ صرف صحاح ستہ اور موطا امام مالکؒ جیسی ادق کتابوں کا مشرح ترجمہ کیا بلکہ اردو زبان میں حدیث کی ایک نہایت جامع اور مبسوط لغت بھی تیار کی، جس کی اس زبان میں کوئی دوسری نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ تذکرہ سات ابواب پر مشتمل ہے یعنی حسب و نسب اور تعلیم و تربیت، ملازمت، علوم سے شغف، اخلاق و عادات، ہجرت اور وفات، تقویٰ خدمات اور تصنیفات و تالیفات۔

تبصرہ نگار کے نزدیک کسی مسلمان کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ عالم دین ہو کر اپنی قابلیتیں اور صلاحیتیں ایسے کاموں میں کھپاتے جو دین کی ضد ہوں۔ چنانچہ بزرگانِ دین نے اپنے شاگردوں کو ملازمتوں کے چکر سے ہمیشہ الگ رہنے کی تلقین کی۔ ایک مشہور و معروف دینی درسگاہ کے طلبا جب اسناد لیکر رخصت ہونے لگے تو انہوں نے اپنے شیخ سے نصیحت کے لیے درخواست کی۔ انہوں نے فرمایا: "بیٹا مولوی فاضل نہ کرنا"۔ اس مختصر سے فقرے میں پند و نصائح کا ایک خزانہ موجود ہے۔

علامہ وحید الزماں صاحب نے بھی حیدرآباد میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ اس ملازمت کے سلسلے میں اُن کے تاثرات پڑھنے کے قابل ہیں۔

"میں اپنے مالک سے بہت شرمندہ ہوں، عمر کا اکثر حصہ مشتبہ اموال کھانے میں گذرا لیکن بعض اوقات میں ایسا کیا کرتا تھا کہ تنخواہ کا روپیہ تو اپنے کھانے پینے میں صرف کرتا اور مشتبہ روپیہ سرکاری محصولات، ریلوے چارج اور نوکروں کی تنخواہ وغیرہ میں دیتا۔ اب جبکہ مجھ کو وظیفہ ہو گیا ہے تو کئی مشتبہ ذرائع سے میں علیحدہ ہو گیا ہوں۔ لیکن اب بھی جو تنخواہ سرکار سے ملتی ہے وہ بھی مشتبہ میں داخل ہے۔ کیونکہ سرکاری پیشہ میں شراب

اور سیندھی اور مسکرات کی آمدنی بھی مخلوط ہے اور جنگلات وغیرہ کی آمدنی جو خلاف شرع بنے بھی شریک ہے غرض کہ اس عمر مجھ کو خالص مال حلال طیب جس میں ذرا شبہ نہ ہو کھانا بہت کم نصیب ہوا ہے۔ معلوم نہیں آخرت میں میرا کیا حال ہونا ہے۔ باوجود علم کے میں نے ایسے ایسے سخت گناہ کئے ہیں کہ ان کے یاد کرنے سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یا اللہ بجز تیرے عفو اور مغفرت کے کوئی صورت نجات کی نہیں" ص ۳۹

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"میں خود اپنا حال کہتا ہوں۔ جب میں دنیا دار نواب کی صحبت میں تھا تو بہت سی خلاف شرع باتوں پر میں نے سکوت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے معافی کا امیدوار ہوں۔ استغفر و اتوب الیک" ص ۴۱

مولانا مرحوم کو تدریس کے دوران میں عربی نصاب تعلیم کی بعض خامیوں کا بڑی شدت سے احساس تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر اس کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

"افسوس ہمارے زمانے کے مولویوں پر انہوں نے جو کام کے علوم تھے ان کو تو بالکل چھوڑ دیا ہے، یا کچھ ذرا سا برائے نام پڑھا دیتے ہیں۔ لغت عرب اور علم ادب میں تو ذرا رغبت نہیں کرتے اور بیکار علوم جیسے منطق اور فلسفہ قائم ہے ان پر برسوں اپنی عمر ضائع کرتے ہیں۔ میں نے اکثر طالب علموں کو دیکھا جو شرح مطالع اور شرح سلم اور افق المبین حاشیہ قدیمہ اور جدیدہ اور اجدا و زواہد ثلثہ تک پڑھے ہوتے تھے اور صدرہ اور شمس بازغہ بھی چاٹ گئے تھے۔ لیکن عربی کی ایک سطر، عبارت یا مختصر خط بامحاورہ عربی میں لکھنے سے عاجز ہیں" ص ۹۲

مولانا کے مزاج میں ایک نوع کا تلون اور انتہا پسندی ہونے کی بنا پر بعض عجیب و غریب قسم کی علمی لغزشیں بھی ہوتی رہیں۔ ان کی نہ تو رائے پختہ ہوتی اور نہ ہی ان کے اندر اعتدال پیدا ہو سکا۔ اسی بنا پر وہ زندگی کی ہر منزل پر کسی نہ کسی فرقے سے الجھتے رہے۔ فاضل مصنف نے نہایت واضح

الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ کتاب کا سب سے قیمتی باب تصنیفات و تالیفات ہے جس میں اُن کے علمی کارناموں کا بیان ملتا ہے۔

طباعت و کتابت نہایت عمدہ اور ناشر کے معیار کے عین مطابق۔

ماہنامہ روحانی دنیا | مرتبہ سید محمد نبی ایڈووکیٹ لکھنؤ (بھارت)

مقام اشاعت: مکتبہ "روحانی دنیا" ہیوٹ روڈ، لکھنؤ۔ چندہ سالانہ۔ سات روپے فی جلد دس آنے۔

زیر تبصرہ شمارہ اس ماہنامے کا پہلا نمبر ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے گہرے دلی جذبات کے ساتھ پیشۂ وکالت کو ترک کرنے کے وجوہ پر بحث کی ہے۔ اس داستان کے ہر لفظ سے ایک زندہ اور حساس دل کی کیفیات واضح ہوتی ہیں اور پڑھنے والے کو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ضمیر اگر جاگ رہا ہو تو اسے ہر قدم پر "کرب و بلا" کے کن معرکوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک انسان مکر و فریب، چالاکی، عیاری اور چرب زبانی سے دوسروں کا منہ تو بند کر سکتا ہے لیکن اپنے اُس دل کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتا جس میں زندگی کی کوئی رمق بھی موجود ہو۔ پورا شمارہ ماحول اور ضمیر کی اسی کشمکش کے بیان پر مشتمل ہے اسی سلسلہ میں فاضل مصنف کے تاثرات ملاحظہ فرمائیں:

"ہر کامیابی کے بعد مجھے بجائے خوشی کے پچھتانا پڑتا تھا اور عرصہ تک سوچتا رہتا تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا، محض روپیہ کی خاطر۔ ورنہ اصل معاملہ سے میرا کیا تعلق تھا اور یہ خیال میرے دل میں ایک طرح کی کڑھن اور کسک پیدا کر دیتا تھا کہ وہ پیسے محض روپیہ کے لیے ہم نے جائز کا ناجائز، ناحق کا حق کر دکھایا . . .

اسی درمیان میں اللہ تعالیٰ نے عربی پڑھنے کا ایک موقع نصیب فرمایا . . .

. . . خدا کا شکر ہے، تین برس میں ان حضرات نے مجھ ناچیز کو اس قابل بنا دیا کہ قرآن مجید کا مفہوم سمجھنے لگا۔ اس کے بعد تو یہ حال ہوا کہ وکالت کے ساتھ نماز بھی منافقت

معلوم ہونے لگی۔ وکالت کی آمدنی سے روزہ افطار کرنا بھی دشوار ہوگیا۔ تلاوتِ قرآن سے بجائے سکون نصیب ہونے کے دل گھبرانے لگا اور میں عجیب و غریب کشمکش میں پڑ گیا۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ وکالت کے ساتھ صحیح اسلامی زندگی کا جوڑ کسی طرح بیٹھتا ہی نہیں تھا۔ وکالت چھوڑتا ہوں تو ساری زندگی کی محنت بیکار ہوئی جاتی ہے اور تمام امیدوں پر پانی پھرا جاتا ہے . . . . . . اور یہ ایک مستقل سوال میرے پیشِ نظر رہنے لگا کہ کیا کروں۔ آیا ضمیر کی آواز کو دبا دوں اور دنیا کماتا رہوں یا ایمان سنبھالوں۔

جناب سید محمد تقی صاحب نے آخر میں پیشۂ وکالت پر اخلاقی اور شرعی نقطۂ نظر سے بڑی مدلل بحث کی ہے۔ اسی ضمن میں وہ فرماتے ہیں:

"واقعات شاہد ہیں کہ اگر کوئی مؤکل روپیہ خرچ کر سکتا ہے اور مقدمہ کی اچھی پیروی کر سکتا ہے تو وہ سنگین جرموں کی پاداش سے بھی آخر میں کسی نہ کسی عدالت سے چھوٹ ہی جاتا ہے . . . . روزمرہ اسی قسم کے مقدمات ہوتے رہتے ہیں کہ اصل مجرم قانون کی پیچیدگیوں اور وکیلوں کی قابلیت کی بدولت چھوٹ جاتے ہیں۔ قاتل، چور اور ڈاکو بغیس بجاتے، سینہ تانے وکیلوں ہی کے طفیل جیل خانوں سے باہر آجاتے ہیں۔"

اس پورے شمارے میں اسی قسم کے احساسات قلمبند کیے گئے ہیں۔ اس نوع کی تحریریں جو ایک صاحبِ دل انسان کے قلم سے نکلیں وہ عملی اعتبار سے بڑی نافع ہوتی ہیں وہ حضرات جو آج ماحول کے تقاضوں اور ایمان کے مطالبات کے درمیان اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس پاتے ہیں انہیں اس کتابچے میں انشاء اللہ بڑی تسکین کا سامان ملیگا۔

رابعۂ بصری | تالیف سیدہ وداد السکاکینی۔ ترجمہ: عبد الصمد صارم الازہری طابع و ناشر:

مکتبۂ جدید، لاہور۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ صفحات ۱۳۴۔

مکتبۂ جدید نے سستی کتابوں کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اُس میں یہ کتاب ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اس میں اُس عظیم خاتون کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ یادِ الٰہی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وردا السکاکینی نے بڑی محنت کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔ اور فاضل مترجم نے بڑی عمدگی کے ساتھ اسے اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے دو چیزیں عام قاری کو کھٹکتی ہیں۔ ایک تو ترجمے کی زبان اُن بچیوں کے معیار سے بہت اونچی ہے جن کے لیے یہ کتاب زیادہ سے زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔ دوسرے بعض مقامات پر قرآن و سنت کی تصریحات کی بھی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ماہنامہ تعمیرِ انسانیت عید قربان نمبر | مرتب جناب عبدالحمید شیخ صاحب۔ سالانہ چندہ پانچ روپے فی شمارہ ۸ آنے۔ عید نمبر ۱۲ آنے۔ مقام اشاعت دفتر ماہنامہ تعمیرِ انسانیت۔ موچی دروازہ۔ لاہور۔

یہ رسالہ ایک عرصہ سے دین و ملت کی نہایت اچھی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ زیرِ نظر رسالہ اس کا خاص نمبر ہے۔ اس میں ہند و پاک کے نامور اہلِ علم کی نگارشات شامل ہیں۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ظفر علی خاں مرحوم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا نعیم صدیقی صاحب اور مولانا ماہر القادری۔ رسالہ معنوی اور صوری خوبیوں کا حسین مرقع ہے اور ہر لحاظ سے قابلِ ستائش۔

خـــالی صفحـــه

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۱ - سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

کی دو نئی مطبوعات

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

از

مولانا سید ابوالا اعلیٰ مودودی

بعد نظر ثانی و تکمیل پہلی مرتبہ

قیمت مجلد مع دیدہ زیب گرد پوش ساڑھے چار روپے

یہ کتاب پہلی مرتبہ مولانا موصوف کی اسارت
(۱۹۵۵-۵۳) کے زمانے میں غیر مکمل شائع
ہوئی تھی - اب مولانا نے اسکی نظر ثانی
بھی کی ہے اور اسے مکمل بھی کر دیا
ہے - یہ کتاب اپنے موضوع پر بے
مثال کتاب ہے

★

اسلام اور ضبط ولادت

از

مولانا سید ابوالا اعلیٰ مودودی

قیمت ایک روپیہ

اپنے قریبی کتب فروش یا اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۱ - سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور
سے طلب فرمائیں